امام حسن البنّاؒ

ایک مثالی شخصیت

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

امریکن صحافی رابرٹ جاکسن

ترجمہ

مولانا شمس الحق ندوی

ترتیبِ جدید

فیصل احمد ندوی بھٹکلی

ادارۂ احیاے علم ودعوت، لکھنؤ   مکتبۃ الشباب العلمیۃ، لکھنؤ

بار اوّل

۱۴۳۴ھ - ۲۰۱۳ء

نام کتاب	:	شیخ حسن البنّا ایک مثالی شخصیت
نام مصنف	:	مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
		امریکن صحافی رابرٹ جاکسن
نام مترجم	:	مولانا شمس الحق ندوی
نام مرتب	:	فیصل احمد ندوی بھٹکلی
صفحات	:	۷۲
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
کمپوزنگ	:	عامر کمپیوٹرس، شباب مارکیٹ، لکھنؤ 9305202797
طباعت	:	کاکوری آفسیٹ پریس، لکھنؤ
طابع وناشر	:	ادارۂ احیاے علم ودعوت، لکھنؤ-مکتبۃ الشباب العلمیۃ، لکھنؤ

تقسیم کار

مکتبة الشباب العلمية

شباب مارکیٹ، ندوہ روڈ، ڈالی گنج لکھنؤ

موبائل نمبر: 9696437283, 9198621671

فہرست مضامین

امام حسن البنا: ایک مثالی شخصیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مرتب

اگر سوال کیا جائے سرزمین عرب پر سب سے زیادہ جامع، ہمہ گیر اور سب سے زیادہ مؤثر تحریک کونسی وجود میں آئی، تو دوست، دشمن سب کا جواب ہوگا تحریک ''الاخوان المسلمون''، لیکن انصاف شرط ہے۔

عقیدہ وعبادات سے لے کر اقتصاد وسیاست، اخلاق ومعاملات، جسمانی وروحانی تربیت وغیرہ دیگر تمام امور کو حاوی مکمل اسلام کی نمایندگی کرنے والی اخوان کو چھوڑ کر روے زمین پر غالباً کسی تنظیم کا وجود نہیں، جغرافیائی لحاظ سے اس کے حدود سب سے زیادہ وسیع ہیں اور افرادی لحاظ سے اس کی تعداد سب سے زیادہ ہے، اس وقت ۷۲ ممالک میں اس کی شاخیں ہیں اور دس کروڑ اس کے ممبروں کی تعداد ہے۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صحابہؓ کے بعد کسی نے دین کے لیے مجموعی طور پر اتنی قربانیاں نہیں دیں جتنی اخوان نے دی، اس کے کچھ اندازے کے لیے ''زنداں کے شب وروز'' اور ''رودادِ ابتلا'' کا مطالعہ کافی ہوسکتا ہے۔ اسّی سال کی مسلسل قربانیوں کے بعد گزشتہ سال مصر میں جمہوری طور پر منتخب اخوان کی حکومت قائم ہوئی تو وہ امریکہ واسرائیل اور اسلام دشمنوں کی آنکھ میں کانٹا بن کر کھٹکنے لگی، بلکہ عرب ممالک کے گدی نشینوں کو بھی ایک آنکھ نہیں بھائی، اور اکثر ملکوں نے اس منتخب جمہوری اسلامی حکومت کو گرانے کے لیے اپنے خزانوں کے دہانے کھول دیے، پھر جو کچھ ہوا دنیا جانتی ہے۔ ظالم وجابر فوجی ٹولے نے اسرائیل وامریکہ کی سرپرستی میں اور خلیج کے چند عرب ممالک کے تعاون سے منتخب

اسلام پسند حکمراں محمد مرسی کو قید و بند میں ڈال کر حکومت پر قبضہ کرلیا، اور تاریخ میں پہلی بار کسی اسلامی ملک میں ایک یہودی (منصور عدلی) کو کرسی صدارت پر بٹھایا، یہودی جونصِ قرآنی کے بموجب مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اور ہمیشہ رہیں گے، وہ مسلم ملک میں تختِ سلطنت کا مالک ہو، مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کیا ذلت ہوگی۔ تاریخ میں مسلمانوں کی ذلت کا شاید ہی کبھی ایسا موقع آیا ہو!!

اخوان المسلمون از اول تا آخر مکمل اسلامی تنظیم ہے اور اسی وجہ سے اس کو ان آزمایشوں سے گزرنا پڑ رہا ہے، اخوان کی مکمل اسلامیت اور اسلام کے لیے ان کی قربانیوں کی وجہ سے تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے اور تحریکات کا بھرپور مطالعہ کرنے والے جہاں دیدہ اللہ کے صالح بندے حضرت مولانا علی میاںؒ نے کہا تھا، اور کہا کیا، اللہ نے ان سے کہلوایا کہ **''اخوان سے وہی محبت کرے گا جو مومن ہوگا اور وہی ان سے نفرت کرے گا جو منافق ہوگا''۔**

مگر افسوس کہ ان حقائق کے باوجود مسلمانوں کا ایک طبقہ اخوان کو بددین سمجھتا ہے، اور ''نقلِ کفر کفر نباشد'' ان کو خوارج کے مماثل قرار دے کر خود اپنے ایمان کا سودا کرتا ہے!!

ان حالات میں ضرورت محسوس ہوئی کہ اخوان کا مختصر تعارف عوام الناس کے سامنے پیش کیا جائے کہ اگر ناواقفیت کی بنا پر کوئی غلط فہمی کا شکار ہو تو اس کی غلط فہمی دور ہو جائے، مگر ضد، عناد، حسد اور تعصب کا کوئی علاج نہیں!

اس کتابچے میں سب سے پہلا مضمون مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، جنھوں نے تحریک اخوان المسلمون کو بہت قریب سے دیکھا، امام حسن البنا کے والد سے ملاقات کی، ان کے ساتھیوں اور شاگردوں کے ساتھ ایک عرصہ گزارا، مولانا علی میاں کا مضمون اس وجہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ مولانا نے تاریخ اسلام کی تحریکات کا گہرا مطالعہ کیا تھا، ان کا اعتراف اور شہادت ایک واقف کار کی شہادت ہے، و لاینبئك مثل خبیر.

دوسرا مضمون جو اس رسالے کا سب سے اہم حصہ ہے وہ ایک امریکی صحافی رابرٹ جاکسن کا ہے، امام حسن البنا سے براہ راست اس نے خود ملاقات کی ہے، پھر ان

کے رفقاء سے مل کر اوران کے اثرات دیکھ کر اس نے امام حسن البنا اوران کی تحریک کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی ہے، اس نے اپنے مضمون میں حسن البنا کو جوخراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ غیر مسلم ہوتے ہوئے اس نے کس دیانت داری اور انصاف کے ساتھ حسن البنا کی شخصیت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے!۔

ان دونوں مضامین کا ترجمہ مولانا شمس الحق ندوی (استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء ومدیر تعمیر حیات، ندوۃ العلماء، لکھنؤ) نے کیا تھا، اس کا پہلا ایڈیشن آج سے بتیس سال پہلے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا تھا، اب حضرت نے موجودہ حالات کے پیش نظر ہماری خواہش پر مقدمے میں کچھ اضافہ کیا ہے، جس کے لیے ہم حضرت کے ممنون ہیں۔

اس ایڈیشن میں مولانا سید سلمان حسینی ندوی (عمید کلیۃ الدعوۃ والاعلام واستاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء) کے پیش لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مولانا نے مصر میں اخوان کے ذمہ داروں سے متعدد ملاقاتوں کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک میں اخوان کو دیکھا ہے، اوران کی سرگرمیوں کا مشاہدہ کیا ہے، اوراب بھی ان سے قریبی تعلق رکھتے ہیں، اس حیثیت سے مولانا اخوان کو جس طرح جانتے ہیں بہت کم لوگوں کو اس کے مواقع حاصل ہیں۔

ضمیمے کے طور پر اخیر میں چند مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے، پہلا مضمون خود تحریک کے بانی مبانی امام حسن البنا شہیدؒ کا ہے، اس میں انھوں نے تحریک اخوان المسلمون کی اساس، اس کے نظریے، مقاصد اور سرگرمیوں کا تعارف بہت وضاحت اور قوت سے کیا ہے، اورایک تحریک کو سمجھنے کے لیے اس کے بانی اور مؤسس کے افکار وخیالات اوراس کی زبان وقلم سے نکلی ہوئی تصریحات سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ اس مضمون کا عنوان ''اخوان المسلمون کا اسلام'' ہے۔ اس میں انھوں نے پوری طاقت کے ساتھ صراحت کی ہے کہ وہ اسلام جو بہت سے ذہنوں کی پیداوار ہے، کیا اخوان اسی طرح کے اسلام کے قائل ہیں یا وہ، وہ اسلام ہے جو قرآن وحدیث اور سلف صالحین کے طریقے سے معلوم ہوتا ہے۔ حسنِ اتفاق کہ رابرٹ جاکسن

نے اپنا مضمون جس نقطے پر ختم کیا ہے اور جو سوال اٹھایا ہے اس کا یہ بھرپور جواب بھی ہے۔

دوسرا ضمیمہ مولانا نذرالحفیظ صاحب ندوی ازہری (عمید کلیۃ اللغۃ والآداب دارالعلوم ندوۃ العلماء) کے مضمون پر مشتمل ہے۔ مولانا نے خود جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کی ہے، اس کے علاوہ متعدد دفعہ مصر جانا ہوا ہے، تحریک اخوان المسلمون کو مشاہدے اور مطالعے سے جو انھوں نے سمجھا ہے، کم لوگ اس معاملے میں ان کے برابر ہوں گے۔ ان کا یہ مضمون اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں انھوں نے جدید انقلاب تک، اخوان کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی ہے، مختلف میدانوں میں ان کی خدمات اور عالم عربی پر اس تحریک کے اثرات کا ایک مختصر جائزہ لیا ہے۔

اس کے بعد امام حسن البنا کی شخصیت اور ذاتی حالات پر چند سطریں ہیں، تا کہ ان کی شخصیت کا بھرپور تعارف قاری کے سامنے آجائے۔

اخیر میں امام حسن البنا اور تحریک اخوان المسلمون پر ایک سو سے زیادہ اہم کتابوں کی فہرست درج کی گئی ہے کہ اگر کوئی مفصل اور صحیح معلومات حاصل کرنا چاہے تو ان کتابوں سے اس کو فائدہ پہنچے۔ اس فہرست کی تیاری میں ہمیں برادر محترم ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی سے بیش قیمت مدد ملی۔

ہم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مد ظلہم، مولانا شمس الحق ندوی، مولانا نذرالحفیظ ندوی، مولانا سید سلمان حسینی ندوی، برادرِ محترم ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی اور جن کا بھی تعاون حاصل ہوا، سب کے ممنون و مشکور ہیں۔

امید ہے کہ یہ مختصر کتاب ان اضافوں کے ساتھ امام حسن البنا کی شخصیت اور ان کی تحریک ''الاخوان المسلمون'' کو بہتر طور پر سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی اور جو حقیقت کو سمجھ کر حق کا ساتھ دینا چاہتا ہو اس کو ان باتوں سے بڑی مدد ملے گی۔ انّ فـــی ذلك لذکری لمن کان له قلب أو القی السمع و هو شهید.

فیصل احمد ندوی بھٹکلی

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۶/۱۱/۱۴۳۴ھ مطابق ۲۳/۹/۲۰۱۳ء

باسمہ سبحانہ

دیباچہ

تاریخِ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اس دینِ برحق کے تحفظ کے جو وعدے کتاب وسنت میں فرمائے گئے تھے ان کی تکمیل ہر دور میں ایسی ایمانی، دعوتی، اصلاحی اور تجدیدی کوششوں اور تحریکات سے ہوتی رہی جو ہر صدی میں پوری قوت وطاقت اور آب وتاب سے اٹھیں، اور گرد کی ان تہوں کو صاف کرتی رہیں جو اسلام کے صاف وشفاف آئینے پر امتدادِ زمانہ کے ساتھ پڑتی اور جمتی رہیں۔

چودہویں صدی ہجری، بیسویں صدی عیسوی میں عالمِ اسلام میں جو طاقتور، اثر انگیز اور انقلاب آفریں تحریکات مختلف ممالک میں اٹھتی رہیں ان میں اپنی وسعت، ہمہ گیری، قوتِ عمل اور وقت کے زبردست چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے کے اعتبار سے کوئی تحریک ''اخوان المسلمین'' کی تحریک کی ہمسری نہیں کرسکتی۔

عالمی سطح پر انگریزوں کی بالادستی، سامراج اور استبداد، انگریزی تہذیب وتمدن کے مرعوب کن مظاہر، اور مسلمانوں کی ذہنی پسماندگی، احساس کمتری، مغربی تمدن سے شدید مرعوبیت کی فضا اور ماحول میں تحریکِ اخوان المسلمین کے قائد ورہنما جو اقبالؔ کے اس شعر ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

کے سچے مصداق تھے۔ ایمانی حمیت، دینی غیرت، پختہ یقین، محکم عزائم، روشن

دماغ، بالغ نظر، وسعتِ فکر اور درد ومحبت سے بھرا ہوا دل، جیسی نمایاں خصوصیات وصفات سے متصف شخصیت شیخ حسن البنّاؒ نے عالمِ اسلامی کے علمی، فکری، ادبی اور سیاسی مرکز مصر کی سرزمین پر دعوتِ حق کا وہ صور پھونکا، اور تجدیدِ دین کی ایسی طاقتور، شخصیت ساز اور انقلاب انگیز تحریک چلائی جس نے ایمان ویقین اور جہد وعمل کا ایک ایسا تند وتیز سیلِ رواں تیار کردیا جس کو اگر موانع ومصائب وآزمایشوں کے پہاڑ نہ روک دیتے تو عالمِ اسلام کی ہر بنجر زمین سیراب ہوتی، اور اس گزشتہ صدی کی سب سے زیادہ کامیاب، وسیع اور ہمہ گیر تحریک سامنے آتی۔

مصر کی ظالمانہ حکومت، صدر عبدالناصر کی بدعہدی، اپنے اوپر حملے کا ڈرامہ، اور ایک بدترین گھناؤنی سازش کا انتظام اپنے آقاؤں کو خوش کرنے اور اپنے اندر کے شیطان کی بھڑاس نکالنے کے لیے، پھر جیلوں میں اخوانیوں پر رونگٹے کھڑے کردینے والے مظالم کا سلسلہ، اور جیلوں میں ان کے قتل کی وارداتوں، ۱۹٦٦ء میں سید قطب کی پھانسی، اور پھر تسلسل سے فوجی آمروں، امریکہ کے غلاموں اور اسرائیل کے ایجنٹوں کے ذریعے ایک لامتناہی قصۂ دار ورسن ایسا تھا جس کے بعد بظاہر یہ خیال ہوتا تھا کہ اخوانی تنظیم ماضی کا قصہ بن چکی ہے، بعض اہل علم وقلم کی تحریروں سے اسی طرح کی مایوسی کے تاثرات پڑھنے اور زبانی اظہارِ خیال کے ذریعے سننے کو ملتے تھے، لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ ظالموں نے جتنا ان کو کچلا اور دبایا وہ اتنا ہی اُٹھتے، ابھرتے اور عالمی طاقت بنتے چلے گئے، دنیا بھر کی نوجوان تنظیموں نے ان کے لٹریچر کی نشر واشاعت میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ ان سے تحریکی انتساب پر فخر محسوس کیا، اور بہت سی تنظیموں نے اپنے ملکوں میں انھیں کے طرز پر کام شروع کیا، اور اپنے کو ان کی شاخ کی حیثیت دی۔

تحریک کا یہ امتداد مصر سے دور ہی نہیں ہوتا رہا، بلکہ مصر اور اس کے پڑوسی ممالک میں پوری قوت سے تحریک نے اپنی جڑیں مضبوط کرلیں، خاص طور پر سوڈان، یمن، الجزائر اور اردن میں تحریک ایک متبادل طاقت کی حیثیت سے ابھر کر آگئی اور حکومت سازی کے تجربوں کا اس کو موقع ملتا رہا۔ ۱۹۸۰ء میں سرزمین شام کے شہر حماۃ میں جس طرح ٦۰-۷۰ ہزار اخوانیوں

کو شہید کیا گیا اس نے تحریک کے شعلے بھڑکا دیے، جس کو بے رحمی سے کچلا جا تا رہا۔

ایک طویل عرصے کی زمینی محنت کے نتیجے میں ۲۰۱۱ء میں پورے عالم عربی میں انقلاب کی جو لہر اٹھی، اس نے تونس اور لیبیا اور مصر کا منظر نامہ بدل دیا اور اس کا سب سے زیادہ کامیاب ظہور مصر میں ہوا، ڈاکٹر مرسی نے سلطان عبدالحمید ثانی عثمانی کی یادیں تازہ کر دیں، صاف ظاہر تھا کہ کفر والحاد کا کیمپ یا تو انھیں برداشت کرے اور اپنی بساط دیر سویر لپیٹنے کے لیے تیار ہو جائے، یا اس کے تصفیے کا منصوبہ بنا کر دوبارہ زیادہ بے رحمی سے ان کو کچل دے، اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا، بشار الاسد کی ظلم و جرائم کی سیاست کو مصر کے مجرم ٹولے نے زیادہ کامیاب پایا، اور اس مافیائی اور مجرمانہ سیاست کو دہرانا شروع کر دیا، لیکن اب یہ اس ملحدانہ نظام کی حرکت مذبوحی ہے، یہ اس کے آخری شعلے ہیں، اور اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی جا رہی ہے۔

اب نوجوانوں کی نئی نسل موت کا استقبال کرنا سیکھ گئی ہے، اب وہ جہاد کی صدا پر لبیک کہنے پر فخر محسوس کرتے ہیں، دوسری طرف امریکہ اور یوروپ کا دمِ واپسیں ہے، روس کی موت ہو چکی ہے، اس کو اقوام متحدہ کے مجرمانہ نظام نے زندگی کی رمق دے رکھی ہے۔

اس دم توڑتے عالمی نظام کو جمہوریت کے راستے سے نہیں ہٹایا جا سکتا، اس کے لیے اب میدانِ کارزار ہی درکا ہے، اور نئی نسل اس کے لیے تیار ہے، ملت کو بھی اسی کا انتظار ہے۔

سلمان حسینی ندوی

دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱۵/۱۱/۱۴۳۴ھ مطابق ۲۲/۹/۲۰۱۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

زیر نظر کتابچہ دراصل انگریزی کے ایک طویل مضمون کی حیثیت سے شایع ہوا تھا۔ پھر ''مرد قرآنی'' کے نام سے عربی میں ترجمہ کرکے کتابچہ کی شکل میں شایع کیا گیا۔ یہ مضمون ایک یورپین غیر مسلم ''رابرٹ جاکسن'' کے قلم سے ہے، جس میں موجودہ صدی کے ایک مسلمان مصری قائد و مصلح کے حالات و خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ کامیاب مصری قائد تحریک ''الاخوان المسلمون'' کے بانی شیخ حسن البناؒ ہیں جنھوں نے ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۸ء تک کے بیس سالہ عرصے میں لاکھوں مصری باشندوں کو اسلامی جذبے سے سرشار بنادیا اور ایک ایسی جماعت کھڑی کردی جس کو امت اسلامی کی عزت رفتہ کے واپس حاصل کرنے کا ولولہ اور جوش، اور مسلمانوں کی وحدت اور ان کے اصلاحِ حال کی فکر تھی۔

شیخ حسن البنا اپنے ملک کے ایک نام ور عالم اور بزرگ صفت شخصیت شیخ احمد عبدالرحمٰن البنا کے بیٹے تھے، انھوں نے مسلمانوں کو دنیاداری کے برے ماحول میں دیکھ کر تکلیف محسوس کی، اور لوگوں کو اپنی اپنی زندگیوں کو خیر و صلاح کے رنگ میں رنگنے اور اخلاق و عادات کی اصلاح کرنے کی دعوت دینے کا اہتمام کیا، انھوں نے اس کام کو زیادہ منظّم طریقے سے کرنے کے لیے ''الاخوان المسلمون'' یعنی مسلمان بھائیوں کی جماعت بنا کر اصلاح کا بڑا کام انجام دیا، اس کے نتیجے میں نوجوانوں میں بڑا اچھا جذبہ

پیدا ہوا اور بڑی اصلاح ہوئی، جدید تعلیم یافتہ لوگوں پر اس کا خاص طور پر اچھا اثر پڑا، ان کی تقریروں کو لوگ توجہ سے سنتے اور متاثر ہوتے، فوجی ملازمت والے حضرات کو بھی حسب موقع ان کے دینی پروگرام میں شریک ہونے کا موقع ملتا تھا، ان میں کرنل جمال عبدالناصر بھی تھے، وہ اخوان کے جلسوں میں موقع موقع پر شریک ہوتے تھے، ان کی صحبتوں کے اثر سے ان میں بھی اصلاحِ حال کا جذبہ پیدا ہوا۔

مصر میں بادشاہی حکومت تھی اور برطانیہ کے زیر اثر تھی، اس کی برائیاں لوگوں پر عیاں تھیں اور لوگ چاہتے تھے کہ اس نظام میں تبدیلی ہو اور حکومت کو بدل کر ایک نیا نظام لایا جائے، چناں چہ ۱۹۵۲ء میں فوج نے انقلاب کیا، شاہی حکومت ختم ہوئی، جمال عبدالناصر صدر بنائے گئے، الاخوان المسلمون نے ان کا ساتھ دیا، البتہ ان کو ضروری اصلاحات کی طرف توجہ دلائی، اس پر دونوں کے درمیان بتدریج اختلافات شروع ہوئے، اور کشمکش پیدا ہوئی، شیخ حسن البنا کو کچھ دشمن شہید کر چکے تھے، جمال عبدالناصر پر ایک جلسہ میں گولی چلنے کا واقعہ پیش آ گیا، اس کو اخوان کی طرف سے قرار دے کر اس جماعت کو ممنوع قرار دیا گیا اور بکثرت گرفتاریاں عمل میں آئیں، اور ایک اخوانی سید قطب کو ان کی تصنیف پر باغی قرار دے کر پھانسی دے دی گئی، اس بات نے ٹکراؤ کو بہت بڑھا دیا۔

فوجی حکومت اخوان کو باغی اور دشمن قرار دیتی رہی، باہر کی بڑی طاقتوں کی رہنمائی حکومت کو حاصل رہی اور طاقت اور پروپیگنڈے کے ذریعے اسلامی تعلیمات کو بنیاد پرستی، قدامت پرستی اور پھر دہشت گردی کے الفاظ سے بدنام کرتی رہی۔

اس سب کے باوجود اندر اندر ملک کے باشندے اخوان سے جڑے رہے، چناں چہ سال گزشتہ آزادانہ انتخابات کا موقع نکلا، اس میں اخوان کو اکثریتی رائے ملی، اور ان کی حکومت قائم ہوئی جس کو سامراجی طاقتوں نے خطرہ قرار دیا اور باقاعدہ عوامی انتخاب کے ذریعہ قائم شدہ حکومت کو فوج نے برطرف کر دیا اور الزامات لگا کر جیلوں کے حوالے کرنا شروع کر دیا اور ان کے اثرات ختم کرنے کی تدابیر اختیار کی جارہی ہیں۔

شیخ حسن البناؒ کی شخصیت ایک سحر انگیز شخصیت تھی، ان میں ذہانت، متانت، فراست، نیک خلقی بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ وہ لوگوں سے ملتے، اجتماعات کو خطاب کرتے تو سننے والوں کے دلوں کو خواہ کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں موہ لیتے تھے۔ انھوں نے دین وسیاست کو جمع کرنے کی متوازن کوشش کی اور اپنی پُر تاثیر رہنمائی اور تربیت سے ایسی جماعت تیار کی جو سیرت واخلاق کی درستگی، نگہت وحسن عمل کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی وحدت اور اسلامی عزت کے حصول کے لیے ہوئی۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ اس عظیم دعوتی واصلاحی کام کے مضبوط ہونے کے ساتھ ہی شیخ حسن البناؒ کی شہادت پیش آگئی اور یہ جماعت اپنے عظیم بانی اور رہنما سے محروم ہوگئی۔

شیخ حسن البناؒ کی شہادت کے بعد مصر کی سیاست میں ایسے نشیب وفراز آئے کہ اخوان المسلمون کی راہ دشوار ہوگئی اور اس کی شہرت کو نقصان پہنچا۔ یہ وہ دور تھا جب جمال عبدالناصر نے مصری عوام میں اخوان کی مقبولیت واثرات کے پیش نظر جماعت کو اپنے اقتدار کے لیے خطرناک سمجھا اور اس کی طاقت کو محدود وکمزور کرنے کی کوشش کی اور ان کو کچلنے اور دبانے کے لیے سخت سے سخت طریقے اختیار کئے۔ اس وقت سے جمال عبدالناصر اور مصر کے دینی ذہن کے لوگوں کے درمیان ایسا معرکہ شروع ہوا جو جمال عبدالناصر کے انتقال تک جاری رہا۔ اس زمانے کے خاص اور تکلیف دہ حالات میں اخوان کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے نہ آسکی، لیکن اس کے باوجود اس کے بانی شیخ حسن البناؒ کے متعلق تصور برابر اچھا رہا اور ان کا نام عزت سے لیا جاتا رہا۔

ایک دیندار مسلمان اگر شیخ حسن البناؒ کی تعریف کرے تو اس میں تعجب نہیں، لیکن اگر یورپ کا ایک غیر مسلم فاضل غیر جانبدارانہ جائزے میں ان کی شخصیت کو دلفریب اور عظیم ثابت کرے تو یہ نہ صرف تعجب کی بات ہے، بلکہ اس پیش کی جانے والی شخصیت کی عظمت کی بڑی دلیل ہے۔

شیخ حسن البنا کی یہ صفت کہ انھوں نے ایک محدود مدت میں لاکھوں انسانوں

میں ایمان، صلاح، جوش عمل اور احساس عزت پیدا کیا، اور بیس سالہ مدت میں ایک طاقتور اور صالح جماعت کھڑی کر دی، ان کو تاریخ کی عظیم شخصیتوں میں شامل کرتی ہے۔ ان کی گفتگو اور ان کے طرز عمل میں وہ کیا سحر تھا؟ ان کی شخصیت میں وہ کیا تاثیر تھی جس سے ان کو اپنی ایسی مشکل کوشش میں کامیابی حاصل ہوئی؟ اس کو جاننے کے لیے ایک غیر مسلم کے قلم سے نکلا ہوا خراج عقیدت اچھا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔

ضرورت تھی کہ یہ مضمون اردو اور دیگر زبانوں میں منتقل ہو، جن کے پڑھنے لکھنے والے شیخ حسن البناؒ کی شخصیت سے علی العموم ناواقف ہیں خوشی کی بات ہے کہ اردو کی حد تک یہ کام ہمارے نوجوان فاضل مولوی شمس الحق ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء نے کر دیا ہے۔

اس کتابچے کی مزید یہ خصوصیت بھی ہے کہ اس کو عالم عربی کے حالات وتحریکات وشخصیات سے اس برصغیر ہندوپاک میں سب سے زیادہ واقف شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اپنے ایک طاقتور مقدمے سے نوازا ہے۔ یہ مقدمہ بذات خود شیخ حسن البنا کا جچا تلا اور موثر تعارف ہے، یہ مقدمہ اصلاً عربی میں لکھا گیا ہے جو شیخ حسن البنا کی کتاب "مذکرات الدعوۃ والداعیة" میں طبع ہوا ہے، اس کا اردو ترجمہ اس کتابچے کے مترجم ہی نے کیا ہے اور مولانا نے اس کو ملاحظہ فرما لیا ہے۔

برادر عزیز مرحوم مولوی سید محمد الحسنی نے اس مضمون کی اہمیت کی طرف فاضل مترجم کو متوجہ کیا تھا اور اس کے ترجمہ واشاعت کے معاملے میں بہت دلچسپی لی تھی، اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اس رسالے کی اشاعت ان کی ایک یادگار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے یہاں بلند درجات عطا فرمائے۔ آمین

محمد رابع حسنی ندوی

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۶؍ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ

نظر ثانی واضافہ: ۱۵/ ۱۱/ ۱۴۳۴ھ مطابق ۱۴/ ۹/ ۲۰۱۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ حسن البنّاؒ

ایک مثالی شخصیت

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

شیخ حسن البنا شہید رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "مذكرات الدعوة والداعية" کا پیش لفظ لکھنا میرے لیے بڑے شرف وسعادت کی بات ہے۔ یہ میری نگاہ میں ان مہتم بالشان کاموں میں سے ہے جو تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہو سکتے ہیں، یہ مقدمہ لکھ کر میں دوسروں سے پہلے اپنے اوپر احسان کر رہا ہوں، اور مسرور وشاد ماں ہوں، یہ کتاب دوسری عام کتابوں کی طرح نہیں ہے، نہ اس کا مصنف دوسرے عام مصنفین کی طرح ہے۔ اس کتاب کا موضوع بھی ان عام موضوعات سے مختلف ہے جن پر عام طور پر صحافی اور منصف لکھتے رہتے ہیں۔

مقدمہ نگار ایسی اہم کتاب اور اس کے عظیم مصنف پر لکھتے اور روشنی ڈالتے ہوئے عرصے تک جھجکتا اور ہچکچاتا رہا، اور جب یہ اندیشہ ہونے لگا کہ مزید تاخیر کر کے مسلم نوجوانوں، نیز دعوت واصلاح کے میدان میں کام کرنے والوں کو ایک خیر سے محروم رکھ رہا ہوں، تب میں نے اس پر چند سطریں لکھنے کی جرأت کی (۱)۔

---

(۱) اس کتاب کا نیا ایڈیشن بیروت سے شائع ہو رہا تھا، اس کے ذمہ دار و محرک شیخ حسن البنا کے لائق و نامور داماد سعید رمضان مدیر رسالہ "المسلمون" نے راقم سطور کو مقدمہ لکھنے کے لیے خط لکھا۔ راقم کو اپنی دوسری مصروفیتوں، آنکھ کی تکلیف کی وجہ سے عرصے تک موقع نہیں ملا۔ اس نے چاہا کہ وہ اس کام سے معذرت کر دے، لیکن ڈاکٹر سعید رمضان کا تار آیا کہ جب تک آپ کا مقدمہ نہیں آئے گا کتاب نہیں چھپے گی، مجبوراً نقاہت کی حالت میں اس کو املا کرانا پڑا اور کتاب اس مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی۔

اسلام ابدی اور خدا کا پسندیدہ دین، اور امت مسلمہ اس کا شاداب اور سدا بہار درخت ہے، یہ خدائی ترکش ہے کہ نہ اس کے تیر ختم ہوتے ہیں اور نہ نشانہ خطا ہوتا ہے، سب سے بڑا ثبوت اس امت میں ایسے مصلحین ومجاہدین، خداداد صلاحیتوں سے مالا مال، موید من اللہ، نادرۂ روزگار، اور اسلام کے لیے باعث صد افتخار شخصیتیں ہیں جو نا سازگار حالات، مخالف ماحول اور بیم ورجا کی تیرہ وتاریک فضا میں ایک ایسی قوم میں پیدا ہوتی ہیں جو فکری زوال واضمحلال، روحانی افلاس، ارادے کی کمزوری، عزم وہمت کی پستی، اخلاق وفساد، راحت طلبی وعافیت پسندی، ہر قوت وطاقت کے سامنے سپر اندازی، اور اصلاح حال سے مایوسی کا شکار ہوتی ہے۔ اس وقت یہ پوری نسل ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوتی ہے، بالکل ایسے ہی جیسے ایک پریس سے شایع ہونے والی کتاب کا کوئی ایڈیشن ہو کہ جس کے ایک نسخے کو پڑھ کر باقی سارے نسخوں کے بارے میں رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اس ماحول ومعاشرے میں نہ کوئی ندرت وجدت ہوتی ہے، نہ حوصلہ مندی وعالی ہمتی کا جذبہ، اس ماحول میں عام ورائج چیزوں کے علاوہ کوئی نئی بات نہیں پائی جاتی اور نہ عام معیار سے اونچی کوئی چیز نظر آتی ہے۔ پوری زندگی ایک ٹرین کے مانند ہے جس کو ایک ہی انجن کھینچ رہا ہے اور وہ شکم پروری ومادہ پرستی، خود غرضی ومصلحت پرستی، لطف اندوزی ونفع خوری کا انجن ہے، یا مادی قوت اور ہوسِ اقتدار کا انجن ہے، پوری زندگی ایک ہی کھیل یا ایک ہی ڈرامہ نظر آتی ہے، جو بڑی مہارت وفنکاری کے ساتھ اسٹیج کیا گیا ہو اور انسانیت یا تاریخِ اسلام کے اسٹیج پر اس کو بار بار دکھایا جا رہا ہو، اور اس کا ہر ہیرو اپنا پارٹ پوری چابک دستی وسلیقہ مندی کے ساتھ ادا کر رہا ہو اور آخر میں یہ ڈرامہ تماشائیوں کی تالیوں یا مقتولین ومجروحین کی آہ وبکا پر ختم ہو جائے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں پورے عالم عربی خصوصاً مصر میں یہی ڈرامہ اسٹیج ہو رہا تھا، قافلہ رواں دواں تھا، زندگی کی ٹرین اپنے محدود مقاصد کے ساتھ نامعلوم منزل کی طرف چل رہی تھی، ایک ہی طرح کی آوازیں آرہی تھیں، ایک ہی راگ الاپا جا رہا تھا کہ پردے کی آڑ سے اچانک ایک شخص نمودار ہوتا ہے، یا یوں کہیے کہ پرانے ملبے کی تہہ

اور تاریخ کی سلوٹوں سے ایک ''مردِ آہن'' باہر آجاتا ہے، اور اس مطمئن اور غافل قافلے کو چونکا دیتا ہے جو چند حقیر مقاصد کی حصول یابی کے سوا کچھ نہیں جانتا، جس کو اپنی دنیاوی ضروریات اور جسمانی راحت و آرام کے سوا کسی اور چیز کی فکر نہیں ہوتی۔

پردے کے پیچھے سے آنے والا یہ شخص، قافلہ والوں کو ہاتھ دیتا ہے، ٹرین کے سامنے خطرے کی جھنڈی ہلاتا ہے۔ اصلاح حال اور انسانیت کے عام رجحان اور اس کے انجام، امت مسلمہ کے مقام اور اس کی اصل ذمے داری کے بارے میں از سرنو غور وفکر کی دعوت دیتا ہے؛ اس امت کو اس کا پیغام یاد دلاتا ہے، وہ بگڑے ہوئے حالات، اخلاقی پستی، گمراہ کن عقائد، جاہلی رسوم وعادات، شکم پروری وہوس پرستی، اور قوت وطاقت کے سامنے سرافگندگی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے؛ وہ ایک صاف ستھری زندگی، ایک نیک چلن اور انصاف پسند معاشرہ اور نئے وپختہ ایمان کی دعوت دیتا ہے؛ وہ ایسے اسلام کی دعوت دیتا ہے جس کی جڑیں مضبوط اور زندگی کے تمام شعبوں میں پیوست ہوں۔ یہ شیر دل شخص بڑی بلندی سے عقابی روح کے ساتھ ایسی بلند و گونجتی ہوئی آواز لگاتا ہے کہ قافلے میں کھلبلی مچ جاتی ہے، اس سے جذبات واحساسات میں ایسا کیف وسرور پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کو نظر انداز کر کے اور اس کو نا قابلِ التفات سمجھ کر اپنی رفتار کا جاری رکھنا ممکن نہیں ہوتا، کچھ لوگ گوش برآواز ہوتے ہیں، کچھ ٹھٹھکتے ہیں پھر آواز لگانے والے کی طرف بڑھنے لگتے ہیں، تھوڑا ہی وقت گزرتا ہے کہ قافلہ والوں کی بڑی تعداد اس کے اردگرد جمع ہو جاتی ہے۔ یہ داعی اس مجموعے سے ایک نیا قافلہ تیار کرتا ہے اور پھر یہ قافلہ اس کی دل لگتی باتوں پر سرمست و سرشار ہو کر، خدا پر بھروسہ واعتماد کر کے بنامِ خدا سفر شروع کرتا ہے۔ ایسے ماحول ومعاشرے کے خلاف آواز بلند کرنے والے ان داعیوں کی زندگی ایسی درخشاں وتابناک ہے کہ اس سے دعوت واصلاح کی تاریخ میں چار چاند لگ جاتے ہیں، یہ داعیان اسلام کا وہ قافلہ ہے جس سے تاریخ اسلام کا کوئی عہد کبھی خالی نہیں رہا۔

اس کتاب کا مصنف جس کا مقدمہ لکھنے کی مجھے سعادت حاصل ہو رہی ہے، ان

شخصیتوں میں سے ہے جنھیں دست قدرت بناتا وسنوارتا ہے، اور خدائی تربیت اسے پروان چڑھاتی ہے، پھر صحیح وقت اور صحیح جگہ پر اس کو کھڑا کر دیتی ہے، فکرِ صالح اور قلبِ سلیم رکھنے والا جو شخص بھی تعصب سے بلند ہو کر اس کتاب کو پڑھے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ شخص خداداد صلاحیتوں سے مالا مال ہے، وہ کسی خاص ماحول یا درس گاہ، تاریخ اور زمانہ، یا محنت وکدوکاوش، یا مشق وتجربے کی پیداوار نہیں، بلکہ وہ توفیقِ خداوندی، حکمتِ ربانی اور اس دین کے ساتھ اس کی عنایت کی پیداوار ہے، وہ ایسا ہونہار پودا ہے جس کی نگہداشت کسی بڑے کام اور بڑی امید کے لیے کی جاتی ہے جہاں اس کی بڑی قیمت ہوتی ہے۔

جو شخص بیسویں صدی کے اوائل میں مشرق وسطیٰ اور خاص طور سے مصر کے حالات سے واقف ہو، اور عالم اسلام کا یہ اہم اور مرکزی حصہ عقیدہ وجذبات، اخلاق ومعاشرت، عزم وارادہ اور جسم وقلب کی جس کمزوری کا شکار تھا اس پر اس کی نظر ہو، ممالیک (مصر کا حاکم خاندانِ غلامان) ترکوں اور خدیو خاندان کے دورِ حکومت نے جو اثرات اس پر چھوڑے تھے، پھر اس میں برطانوی سامراجیوں نے جو اضافہ کیا تھا، اور مغربی تمدن اور موجودہ غیر دینی تعلیم اور مفاد پرست ذہنیت رکھنے والی سیاسی پارٹی بندی نے جو ذہن تیار کیا تھا، وہ بھی اس کی نگاہ کے سامنے ہو۔ اس عہد کے علماء کی کمزوری اور قوت ومادیت کے سامنے ان کی سرافگندگی پر بھی نظر ہو جس نے اس میں مزید نزاکت پیدا کر دی تھی، ان علماء میں سے اکثر امامت ورہنمائی کا منصب چھوڑ چکے تھے اور دعوت وارشاد اور جہاد ومقابلے کے میدان کو خیر باد کہہ کے حالات کی رو میں بہہ رہے تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آواز پست ہو چکی تھی، بے حیائی و بے راہ روی اور الحاد ودہریت کے داعی سرگرمِ عمل تھے، مقبول وکثیر الاشاعت اخبارات ورسائل نے فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والی دعوتوں اور تخریب پسند تحریکوں کے لیے اپنا دامن وسیع کر رکھا تھا۔ یہ اخبارات ورسائل دین اور دینی قدروں، اخلاق اور اس کے اصولوں کا مذاق اڑا رہے تھے، بلادِ عربیہ عموماً اور مصر خصوصاً سطحیت پسندی، ضعف وانحطاط، جذباتیت واخلاقی انارکی اور روحانی زوال کی آخری منزل کو پہنچ چکا تھا۔

ان ملکوں کے یہ شب و روز جس شخص کے علم میں ہوں، پھر وہ ان کی تصویر مصر سے نکلنے والے "الأھرام" "المقطم" "الھلال" اور "المصور" کے آئینہ میں دیکھے، پھر ان کتابوں میں اس کا مشاہدہ کرے جو مصری ادباء وصحافی پیش کر رہے تھے، وہ ادباء وصحافی جن پر مصری نوجوان فریفتہ اور جن کا ان کے دل و دماغ پر جادو تھا، پھر وہ شخص اس پوری صورت حال کا صحیح خدوخال اور پورا عکس مصر کی پر مسرت تقریبوں اور جشن کی محفلوں اور مجلسوں میں دیکھے، نوجوانوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کے ذوق ورجحان کا ان کی محفلوں اور جلسوں میں مشاہدہ کرے، وہ اسکندریہ اور اس کے ساحل کے حیا سوز مناظر دیکھے، اس نے اسکاوٹوں کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہو، کھیل وورزش کے میدانوں میں رہا ہو، سنیما گھروں میں مقامی وبیرونی فلموں کو دیکھا ہو، ان مخرّبِ اخلاق افسانوں کو پڑھا ہو جو مصری پریس سے سیلاب کی طرح ابل رہے تھے، اور نوجوان ان پر پروانوں کی طرح گرتے تھے، اس نے زندگی کے میدان میں لوگوں سے گھل مل کر وقت گزارا ہو، وہاں پیش آنے والی چیزوں کو دیکھا ہو، زندگی سے الگ تھلگ رہ کر خیالی دنیا میں وقت گزارنے والا نہ ہو، تو اس پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ مسلمان ان پُر آشوب گھڑیوں میں کیسی زبوں حالی کا شکار تھے، اور عالم اسلام کے اس اہم خطے میں جس کو عالم عربی کا قائد اور رہنما ہونا چاہیے تھا، جو صدیوں سے اسلام کے لیے سینہ سپر اور علوم اسلامیہ کا مرکز رہا، جس نے ہمیشہ عالم عربی کی مدد کی تھی اور اس کو سہارا دیا تھا، اور اسلامی تاریخ کی نازک ومشکل ترین گھڑیوں میں اس کو بچایا تھا، جس میں سب سے بڑا و پرانا اسلامی وثقافتی مرکز "جامع ازہر" اب بھی موجود ہے، دعوت اسلامی کس زبوں حالی کا شکار تھی!

اس پُر آشوب دور کو کتابوں کے ذریعے نہیں بلکہ قریب رہ کر دیکھا ہو، وہی اس شخصیت کی عظمت وانفرادیت کو سمجھ سکتا ہے، جو یکا یک پردے کے پیچھے سے باہر آ گئی، اور پہلے مصر پھر پورے عالم عربی کو اپنی دعوت وتربیت، جہاد اور طاقت ور شخصیت کے ذریعے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس "رجل رشید" اور فرزند فرید میں ایسی قوتیں

وصلاحیتیں جمع فرمادی تھیں جو انسانی نفسیات اور علم الاخلاق کے ماہرین اور متعدد نقاد ومؤرخین کے نزدیک متضاد تھیں۔ بے مثال وتابان عقل، اعلیٰ درجے کی فہم وذکاوت، ابلتا ہوا جوش وولولہ، ایمان ویقین سے لبریز دل، قوی روحانیت، فصیح وبلیغ زبان، انفرادی زندگی میں غلو وتقشّف سے پاک، زہد وقناعت، حوصلہ مندی وعالی ہمتی، جوش وشوقِ فراواں سے بھرپور دل، بلند پرواز وعقابی روح رکھنے والی ہمت، سحر آفرین دوربین نگاہ، اپنی دعوت کی روح ومزاج کی حفاظت کا اہتمام، ذاتی معاملات میں حددرجہ تواضع وخاکساری اور اقبال کے اس شعر کا صحیح مصداق ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

بڑا خوش بیان، بہت محبوب اور ہردل عزیز۔ مجھ سے بہت سے لوگوں نے بیان کیا کہ وہ روشنی کے ہلکے پرتو کی طرح تھے جس میں نہ ناگواری وتیزی ہوتی ہے نہ سایہ وتاریکی۔ ان اعلیٰ صفات وخداداد صلاحیتوں نے ایک ایسی دینی واجتماعی قیادت کی تشکیل میں ان کی مدد کی، جس سے زیادہ مؤثر وعمیق، اور نتیجہ خیز دینی وسیاسی قیادت مدتِ دراز سے عالم عربی میں وجود میں نہیں آئی تھی، ان صفات نے ایک ایسی دینی، اسلامی تحریک پیدا کردی جس سے زیادہ ہمہ گیر وفعال تحریک خصوصاً عرب ممالک میں عرصے سے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ یوں تو قدرتی صلاحیتوں سے مالامال یہ داعی جامعِ کمالات تھا، مگر دو صفتیں اس میں ایسی تھیں جو وہ بہت کم داعیوں، مصلحین اور قائدین میں پائی جاتی ہیں (۱)۔

پہلی صفت اپنی دعوت وتحریک سے غیر معمولی شغف اور اس پر کامل اطمینان وانشراح اور اس کے لیے پوری فنائیت اور اپنی ساری صلاحیتوں وتوانائیوں، وسائل وطاقتوں کے ساتھ اس میں ہمہ تن مشغول رہنا۔ ان داعیوں اور قائدین کے لیے جن سے اللہ تعالیٰ کوئی بڑا کام لیتا ہے اور عمومی فائدہ پہنچاتا ہے یہ اہم اور بنیادی شرط ہے۔

(۱) ان عنقا صفت لوگوں میں ایک مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ (بانی جماعت تبلیغ) دوسرے ان کے لائق وہونہار فرزند اور خلف رشید مولانا محمد یوسف صاحبؒ تھے۔ یہ دونوں حضرات ان دونوں چیزوں میں آخری مثال تھے۔

ان کی دوسری اہم خصوصیت وصفت تربیت و مردم سازی کے کام میں ان کی حیرت انگیز کامیابی ہے، انھوں نے ایک نئی نسل تیار کی، وہ ایک پوری قوم کے مربی تھے، وہ ایک علمی، فکری اور اخلاقی مکتبۂ فکر کے بانی تھے۔ پڑھے لکھے لوگوں اور اہل منصب میں جو بھی ان کے ساتھ کچھ دن رہا، ان کے فکر ورجحان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اپنے ہم نشینوں پر ان کا اثر ایسا گہرا تھا کہ عرصہ گزر جانے اور طرح طرح کے انقلابات وتغیرات پیش آنے کے باوجود بھی ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی یہ اثر ایسا شعار وعلامت بن گیا ہے کہ زمان ومکان کی تبدیلی کے باوجود اسی سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

اس کا افسوس ہے کہ مصر یا بیرون مصر مجھے ان سے ملاقات کی سعادت نہ حاصل ہوسکی۔ پہلا سال جس میں اللہ تعالیٰ نے میرے لیے حج وزیارت مقدر فرمائی تھی اور میں پہلی بار ہندوستان سے باہر نکلا تھا، وہ ۱۹۴۷ء تھا جس میں شیخ حسن البنا حجاز مقدس تشریف نہ لائے تھے، بلکہ وہ اس سال مصر سے باہر نہیں نکلے تھے، حالانکہ کم ایسا ہوتا کہ وہ اپنی دعوت وتحریک کے لیے رفقاء کے ساتھ حج کے موقع پر حجاز نہ آتے ہوں اور اپنی دعوت کو پھیلانے اور حج کے لیے باہر سے آئے ہوئے وفود سے ملنے کی خاصی کوشش نہ کرتے ہوں۔

حجاز میں مجھے ان کے بعض شاگردوں اور کارکنوں سے ملنے کا موقع ملا اور میں نے ان کے اندر ایک زبردست قائد ومربی کے اثرات نمایاں طور پر محسوس کیے، جب ۱۹۵۱ء میں مجھے مصر جانے کا موقع ملا تو وہ جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ ان کی عمر ابھی صرف بیالیس سال تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی شہادت نے لاکھوں مسلمانوں کو سوگوار ودل گرفتہ بنادیا اور عالم اسلام اس تاریخ ساز شخصیت سے محروم ہوگیا، ان سے ملاقات نہ ہونے کا غم ہمیشہ رہے گا، تاہم مصر میں مجھے ان کے شاگردوں سے ملنے کا اچھی طرح موقع ملا اور ان کے درمیان میں ایک فرد خاندان کی طرح رہا، مصر کے زمانۂ قیام میں میں نے ان کے والد بزرگوار شیخ عبدالرحمٰن البنا سے ملاقات کی اور ان سے شیخ شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں گراں قدر معلومات حاصل کیں اور پھر اپنی کتاب ''شرق اوسط کی ڈائری'' میں

اس ملاقات کا حال اور یہ قیمتی معلومات لکھیں۔ میں ان کے رفقاء اور ارکانِ جماعت سے بھی ملا اور ان ملاقاتوں اور معلومات سے اس دعوت کے قائد اور اس مکتب فکر کے بانی کی پوری تصویر میرے سامنے آگئی اور مجھے یقین ہے کہ سچی اور مطابقِ حال تصویر ہے۔

مصر کے اسی سفر میں ان کی یہ کتاب "مذكرات الدعوة والداعية" میرے ہاتھ لگی ان کی شخصیت و دعوت کو سمجھنے کے لیے میں نے اس کتاب کو ان کی بنیادی کتاب اور ان کی شخصیت کی سب سے بڑی کلید پایا، اس کتاب کو پڑھنے والے ہر شخص کو ان کی عظمت و طاقت کے سرچشمہ، ان کی کامیابی اور دلوں پر ان کے اثر و نفوذ کے اسباب کا پتہ بہ آسانی لگ جائے گا۔

اس کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ **ان کی طاقت وقوت کا اصل سرچشمہ فطرتِ سلیم، دل کی پاکیزگی، روح کی بالیدگی، دینی غیرت وحمیت، اسلام کے لیے اضطراب و بے چینی، اس زمانے کے فاسد ماحول پر ان کی بے چینی اور تشویش، اخلاص وللہیت، عبادت کا ذوق وشوق، اور دل کے ٹارچ کو ذکر و دعا، توبہ واستغفار اور آہِ سحر گاہی کے سیلس سے بھرنا تھا، ان ساری خصوصیات وصفات کے ساتھ قوم کے افراد اور عوام الناس سے ان کی محفلوں اور مشغولیت کی جگہوں میں ملنا، غفلت کے اڈوں پر ان سے ملاقات کرنا، اور حکمت وتدبیر کے ساتھ دھیرے دھیرے ان کی تربیت کرنا، ہمہ وقت متحرک اور کام میں مشغول رہنا ان کا شعار تھا۔** اور یہی ساری صفات اسلامی وربانی دعوت اور ایسی دینی تحریک کی جان ہوتی ہیں جو معاشرے میں تعمیری واصلاحی انقلاب لانا چاہتی ہے اور وقت کے دھارے اور تاریخ کے رُخ کو موڑنا چاہتی ہے۔ اس لحاظ سے دعوت واصلاح کے میدان میں کام کرنے والے ہر شخص کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا اور اس پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے غور و فکر کرتے رہنا نہایت مفید ہے۔

اس کتاب کی دوبارہ طباعت اور لوگوں میں اس کو پھیلانے اور عام کرنے پر تعجب نہیں، قابل تعجب یہ بات ہے کہ مسلمانوں کا کوئی کتب خانہ اس کتاب سے خالی ہو، اس اہم دعوت کے اثرات کو ختم کرنے کی کوشش کرنا جس نے عالم عربی کی نئی نسل میں اسلام کی سدا بہار صلاحیت اور اس کے دائمی ہونے کا اعتماد بحال کیا، جس نے جدید نسل کے دلوں

میں ایمان کی نئی چنگاری روشن کی، ان کے احساس کمتری وشکست خوردگی کا مقابلہ کیا، جس سے بڑھ کر کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا، اس دعوت نے نوجوانوں کی بے راہ روی، ان کی اندرونی کمزوری اور ہوا وہوس کے پیچھے دوڑنے کی ذہنیت کا مقابلہ کیا اور اس کے تن نازک میں جان ڈال دی اور اقبال کے الفاظ میں ''کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر'' پیدا کردیا۔

ان کی اس دعوت سے یہ جدید نسل تازہ دم ہوگئی، اس کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا اور اس نے شجاعت وجوانمردی اور صبر وثابت قدمی کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا۔ اس تحریک کے اثرات کو ختم کرنے اور اس کے نقوش کو مٹانے کی کوشش، اور اس کے چلانے والوں کو قید وبند اور جلاوطنی کی سزائیں اور رونگٹے کھڑا کردینے والی اذیتیں، وہ بدترین جرم ہے جس کو تاریخ اسلام کبھی معاف نہیں کرسکتی۔ یہ ایسا المیہ ہے جس کو عالم اسلام کبھی فراموش نہیں کرسکتا، یہ عالم عربی کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور ظلم نہیں ہوسکتا۔ اس جرم کا کفارہ ملک کے کسی بڑی سے بڑی تعمیری وسیاسی خدمت سے نہیں ادا کیا جاسکتا۔ یہ اتنا وحشت ناک جرم ہے کہ جس کی مثال صرف تاتاریوں کی وحشت وبربریت یا قدیم مسیحی دنیا کے دورِ تعصب میں ملتی ہے۔

مردِ قرآنی

امریکن صحافی رابرٹ جاکسن

فروری ۱۹۴۶ء میں جب میں قاہرہ میں تھا، مجھے اخوان المسلمون کے بانی ولیڈر شیخ حسن البنا سے ملنے کا خیال آیا، اس وقت ان کے ماننے والوں کی تعداد کوئی پانچ لاکھ ہوگی، چناں چہ میں نے ان سے ملاقات کی اور اسی زمانے میں اخبار (نیویارک کرانیکل) میں ذیل کے جملے لکھے "میں اس ہفتے ایک ایسے شخص سے ملا جو عصر حاضر کی تاریخ کا عظیم ترین شخص ہوگا، اور اگر اس کی مخالفت میں بہت غیر معمولی حالات پیش آئے (جس کے قرائن نظر آرہے ہیں) تو وہ پردۂ خفا میں چلا جائے گا، یہ شخصیت اخوان المسلمون کے لیڈر شیخ حسن البنا کی ہے"۔ یہ بات میں نے پانچ سال پہلے لکھی تھی۔ بعد میں پیش آنے والے پُرآشوب حالات نے میرے خیالات واندیشوں کی تصدیق کی، اور اس نادرۂ روزگار شخصیت کا چراغِ زندگی بہت سویرے ہی بجھا دیا گیا، اور یہ چراغ ایسی نازک گھڑیوں میں بجھا جب مشرق بڑی امیدوں وآرزوؤں کے ساتھ سامراجیوں سے برسرِ پیکار تھا۔ میں مشرق کی نفسیات کو سمجھ نہ سکا، اس وقت تو اس کو کسی ایسے مصلح وقائد کی شدید ضرورت تھی جو اس کی صفوں کو درست کرے اور انھیں متحد کرکے مشرق کے کھوئے ہوئے وقار کو پھر سے واپس لائے۔ منزل دور اور راہ پُرخطر وتاریک، لیکن انھیں نازک گھڑیوں میں مشرق بڑے المناک طریقہ پر شیخ حسن البنا کو شہید کرکے اپنا چراغِ راہ بجھا دیتا ہے، مشرق کا یہی حال ہے، اس کے ہاتھ جو بھی دولت لگتی ہے وہ زیادہ دنوں تک اس کی حفاظت نہیں کرپاتا۔

قاہرہ کے زمانۂ قیام میں جب مجھے مصری لیڈروں اور پارٹیوں کے صدر حضرات کی ایک بڑی تعداد سے ملنے کا اتفاق ہوا تو حسن البنا نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے میری نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا، بڑے پُرکشش و بڑے شیریں بیان، وہ عربی کے سوا دوسری زبانیں نہیں جانتے تھے، لہٰذا ہماری ان کی گفتگو ترجمان کے ذریعے ہوتی تھی، جو لوگ ترجمانی کا کام انجام دے رہے تھے انھوں نے اخوان المسلمون کے اغراض ومقاصد کو سمجھانے اور مجھے مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی، لیکن طویل گفتگو کے بعد بھی مجھے مطمئن نہ کرسکے۔ شیخ حسن البنا خاموشی کے ساتھ مترجمین کی باتوں کو بھی سنتے رہے اور میرے چہرے کی لکیروں کو بھی پڑھتے رہے، جب انھوں نے محسوس کیا کہ میں مترجمین کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوا، تو انھوں نے مترجمین سے کہا کہ ان سے پوچھو کہ کیا انھوں نے حضرت محمد ﷺ کے بارے میں کچھ پڑھا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ پڑھا ہے، تو دوسرا سوال ہوا کہ آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کام کیے اور جس بات کی دعوت دی اس سے بھی واقف ہیں؟ میں نے سرہلاتے ہوئے جواب دیا: جی ہاں، واقف ہوں۔ میرا جواب سن کر انھوں نے کہا: ہم وہی چاہتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے، شیخ حسن کے ان جچے تلے الفاظ نے میرے ذہن کے دروازے کھول دیئے اور جو بات طویل بحث ومباحثہ سے سمجھ میں نہ آئی تھی فوراً سمجھ میں آ گئی۔

ان کی معصوم سی صورت، سادگی، انتہا درجے کی خود اعتمادی، اور اپنی دعوت پر حیرت انگیز یقین نے میری نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

مجھے توقع تھی اور اس کے پورے آثار وقرائن موجود تھے کہ ایک ایسا وقت آئے گا جب حسن البنا مصر ہی نہیں، بلکہ پورے مشرق کے قومی لیڈر بن جائیں گے۔ کچھ دنوں بعد ان کے حالات، ان کی تاریخ اور ان کے مقاصد اور منصوبوں سے متعلق معلومات و پوری رپورٹ حاصل کرکے میں مصر سے چلا آیا، میں نے اس رپورٹ کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ پھر سید جمال الدین افغانی، محمد عبدہ، محمد احمد المہدی، سید احمد سنوسی اور محمد بن عبدالوہاب کے حالات سے ان

کا موازنہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ شیخ حسن البنا نے ان سب لوگوں کے تجربات سے فائدہ اٹھایا ہے، ان کی تحریک میں ان کے لیے جو مفید چیز تھی وہ انھوں نے لے لی، اور ان لوگوں سے جو چوک یا غلطی ہوئی تھی اس سے احتراز کیا، اس کی ایک روشن مثال یہ ہے کہ انھوں نے دو متضاد چیزوں کو یکجا کر لیا، ایک کو سید جمال الدین نے اپنایا تھا، دوسری کو محمد عبدہ نے۔

جمال الدین افغانی حکومت کے ذریعے اصلاح کرنا چاہتے تھے، اور محمد عبدہ کا نظریہ یہ تھا کہ تربیت ہی کے ذریعے اصلاح ممکن ہے۔ شیخ حسن البنا ان دونوں چیزوں کو ملانے اور اپنانے میں کامیاب ہو گئے اور وہاں تک پہنچے جہاں تک یہ دونوں نہیں پہنچ سکے تھے، شیخ حسن البنا نے مختلف طبقوں کے منتخب، پڑھے لکھے اور مختلف انداز کے تربیت یافتہ لوگوں کو ایک نظریہ اور ایک متعین مقصد پر متحد کر لیا۔

امریکہ سے پھر دوبارہ قاہرہ لوٹنے کے بعد میں شیخ حسن البنا کی تحریک کا برابر جائزہ لیتا رہا اور اس کی فکر میں لگا رہا۔ بالآخر ان کے خلاف شکوک وشبہات کا کیچڑ اچھالا جانے لگا، جس کا انجام یہ ہوا کہ ان کے ساتھی قید کر لئے گئے اور یہ ایسا مرحلہ تھا کہ ان کے ساتھیوں کو اس سے گزرنا ضروری تھا، اس لیے کہ ایسے عبقری لوگوں کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے۔

پھر تھوڑے ہی عرصے بعد منزل مقصود تک پہنچنے سے قبل ہی نہایت المناک طریقے پر انھیں شہید کر دیا گیا، گو میں قاہرہ میں یہی سنتا رہا کہ اپنے گرد نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد جمع کر لینے کے سوا حسن البنا ابھی تک کوئی بڑا کارنامہ نہیں انجام دے سکے۔ مگر معرکۂ فلسطین اور سوئز کی آخری جنگِ آزادی نے یہ ثابت کر دیا کہ انھوں نے اپنے ساتھیوں میں بہادری وجواں مردی کا ایسا حیرت انگیز جذبہ پیدا کر دیا ہے جس کی مثال قرن اول کی اسلامی تاریخ کے علاوہ مشکل ہی سے ملے گی۔

میں اس بات کی شہادت دے سکتا ہوں کہ حسن البنا عورت اور جاہ ومال کے پھندے میں نہ آسکے، اور یہی وہ تین پُر کشش چیزیں اور خاص حربے تھے جن کو سامراجیوں نے مجاہدین پر سب سے زیادہ استعمال کیا، مگر اس عقابی روح رکھنے والے شخص کو دامِ فریب

میں لانے کی ساری تدبیریں ناکام رہیں۔

ان سارے فتنوں اور آزمائشوں سے بچنے میں ان کے سچے تصوف اور فطری زہد کا بڑا دخل تھا۔ شادی عنفوانِ شباب ہی میں کر لی تھی، عسرت و تنگی کے ساتھ زندگی گزارنے اور صبر وقناعت کے عادی پہلے ہی سے تھے، جاہ ومنصب کو انھوں نے ان لوگوں کے اعتماد وعقیدت پر منحصر کر رکھا تھا جو ان کے گرد آ جمع ہوئے تھے، انھوں نے اپنی مختصر وہمہ گیر زندگی جھوٹی شہرت اور عارضی سامانِ عیش وتنعم سے الگ رہ کر گزار دی، وہ مشکلات وحوادث کو جھیلنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے اور وقت آنے پر اس کو متانت وسنجیدگی کے ساتھ جھیل لے جاتے، وہ سکون واطمینان کے ساتھ حوادث کا سامنا کرتے اور جرأت وپامردی کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے۔(۱)

نوشتۂ تقدیر یہ تھا کہ ان کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات دو اہم حادثوں سے وابستہ ہو وہ ۱۹۰۶ء میں جس سال دنشوای کا واقعہ پیش آیا، پیدا ہوئے اور ۱۹۴۹ء میں قیام اسرائیل کے سال وفات پائی۔

شیخ حسن البنا اپنے موافق ومخالف دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ کرنے میں عجیب وغریب صلاحیت کے مالک تھے، وہ اپنے مخالفین پر ناشائستہ انداز میں حملہ نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کو مطمئن کر کے اپنا ہم خیال بنا لینے کی کوشش کرتے، ان کا نظریہ تھا کہ مقصد کا حصول بحث وٹکراؤ سے ممکن نہیں۔

وہ نظریاتی مخالفت کے قائل تھے، مگر اس کو ذاتی عداوت کا سبب نہیں بناتے تھے، اس رواداری اور دور اندیشی کے باوجود وہ اپنے ہمعصروں اور مقابل کے لوگوں کی ایذا رسانی سے محفوظ نہ رہ سکے۔ تمام پارٹیاں اور جماعتیں ان کی شدید مخالف ہوگئیں اور ان کی تحریک کو ناکام بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ وہ عمرؓ وعلیؓ کے نقش قدم پر چل رہے تھے، اور جس طرز کے لوگوں سے حضرت حسینؓ کو سابقہ پڑا تھا اسی طرز کے لوگوں سے ان کا

---

(۱) سامراجیوں نے ایک معمولی واقعہ کو بہانہ بنا کر بری طرح لوگوں کو مارا اور قتل کیا تھا۔ یہ ہندوستان میں جلیان والا باغ کا سا واقعہ تھا۔

بھی ٹکراؤ ہوا، چناں چہ حضرت حسینؓ کی طرح ناقابل بیان بے کسی کے عالم میں وہ شہید بھی ہوئے۔ ان کے مخالفین سے ہم نے بہت سی باتیں سنیں اور یہ متوقع اور طبعی بات تھی، بلکہ یہ ضروری تھا کہ ایسے شخص کے مخالفین پیدا ہوں جس کی جادو بیانی نے اپنے گرد لوگوں کا ایک جم غفیر جمع کرلیا تھا۔ یہ لوگ سیاسی پارٹیوں، جماعتوں، صوفیہ کے حلقوں، قہوہ خانوں اور کلبوں کو چھوڑ کر ان کے گرد جمع ہوئے تھے۔

لہٰذا اس فقیرِ بے نوا کا ان لوگوں کے حسد و کینہ کا نشانہ بننا کوئی تعجب کی بات نہ تھی جس نے اپنے گرد و پیش بہترین نوجوانوں کو جمع کرکے لوگوں کو حیرت زدہ کردیا تھا، ان کی جن باتوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ انھوں نے حضرت عمرؓ کی ایک بہترین و نمایاں صفت کو اپنا شعار بنالیا تھا، وہ یہ کہ انھوں نے اپنے متعلقین کو دعوت کے مادی فوائد سے بالکل الگ رکھا، عبدالرحمٰن، محمد اور عبدالباسط جو ان کے قریبی لوگ تھے، ان کو انھوں نے جماعت کے اونچے عہدوں سے ہمیشہ الگ رکھا اور بارہا ان کا اسی طرح محاسبہ کیا جس طرح حضرت عمرؓ اپنے تعلق والوں کا محاسبہ کیا کرتے تھے اور انھیں ان کی کوتاہیوں پر دوگنی سزا دیتے تھے۔

مجھے ان کے باوقار و سنجیدہ پدر بزرگوار شیخ عبدالرحمٰن البنا سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ میں نے ان کے والد کو بعض اخوانیوں سے کہتے سنا کہ کاش ان کا لڑکا اسلامی موضوع پر کتابیں لکھتا اور اسی پر اکتفا کرتا، مگر شیخ حسن البنا نے ان کو جواب دیا کہ وہ لوگوں سے مل جل کر اور رابطہ و محبت پیدا کرکے ہی اسلام کی خدمت کرنے پر زیادہ منشرح ہیں اور اس طریقۂ کار کو قوم و ملت کے لیے زیادہ مفید و ضروری سمجھتے ہیں۔

یہ امریکی کالم نویس رو بر جاکسون شیخ حسن البنا کی ثقافت و فکر کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتا ہے:

شیخ حسن البنا مشرق کے پہلے وہ داعی تھے جس نے اپنے سامنے ایک مکمل و مرتب پروگرام رکھ کر ٹھوس اور اعلیٰ بنیادوں پر کام کرنا شروع کیا، ان سے پہلے اس انداز

سے کسی نے کام نہیں کیا تھا، خواہ وہ جمال الدین افغانی ہوں، یا محمد عبدہ، اور نہ پارٹیوں اور جماعتوں کے لیڈر جن کے نام پہلی جنگ عظیم کے بعد نمایاں ہوئے، میں اپنے وسیع مطالعے کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ شیخ حسن کی عملی زندگی اور ان کی تگ و دو ٹھیک ان اصولوں کے مطابق تھی جن کی وہ دعوت دے رہے تھے، وہ اسلام کو جس طرح سمجھ رہے تھے اور پھر پورے اخلاص و وارفتگی کے ساتھ جس طرح اس کی دعوت دے رہے تھے اسی طرح خود کو بھی اسی سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ یہ عملی تصویر لوگوں کو بہت متاثر کرتی تھی۔ دوسرے سیاسی لیڈروں اور دینی پیشواؤں میں یہ بات نہیں تھی، ان کے قول و فعل میں تضاد تھا۔

حسن البنا ان لوگوں میں نہیں تھے جو کامیابی کا سستا سودا کرتے ہیں، انھوں نے ذرائع کو مقصد تک پہنچنے کا وسیلہ نہیں بنایا۔ جیسا کہ عام طور پر سیاسی لوگ کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا راستہ پُر خطر تھا، وہ اس خارزار سے پورے عزم و حوصلے کے ساتھ گزرے، ان کی پریشانیوں کا سبب یہ تھا کہ وہ ایسے راستہ پر چلنا چاہتے تھے جو مشکلات کے پتھروں اور چٹانوں سے پُر تھا، اسی لیے وہ اپنے ساتھیوں کو عزم و ہمت کی تلقین کرتے تھے اور انھیں اس عہد کی دلفریبیوں اور خواہشاتِ نفس کی طغیانیوں سے دور رہنے کی نصیحت کرتے تھے جو کشتی نجات کو ٹکراتی اور ڈبو دیتی ہے وہ ''مکمل حل'' کی تلاش میں تھے خواہ اس کا راستہ کتنا ہی طویل ہو، اسی لیے انھوں نے ہر پیش کش اور سودے بازی کو ٹھکرا دیا اور درمیانی و ادھورے حل کو قبول نہ کیا، وہ اس پر ہمیشہ مصر رہے کہ آزادی، وطنیت، قومیت و قیادت کے حصے نہیں کیے جا سکتے، اسی وجہ سے ان کو دشواریاں پیش آئیں، ان کے جن ساتھیوں نے مفاد کو پیش نظر رکھا وہ لالچ و ترغیبات کا مقابلہ نہ کر سکے اور راستے سے الگ ہو گئے۔

وہ حقیقت پسند تھے، اس لیے وہم و گمان سے الگ ہو کر ہر چیز کو حقیقت کے آئینے میں دیکھتے تھے، دیکھنے میں وہ بہت مطمئن و پُرسکون نظر آتے، مگر اندر سے جل رہے ہوتے تھے، ان کے سینے میں قوم و ملت کے درد کی ایک آگ سی لگی ہوئی تھی، وہ عالم اسلام کے بارے میں بڑے غیور تھے، عالم اسلام کے کسی بھی حصے کو زک پہنچے تو وہ تڑپ اٹھتے تھے

اور مضطرب و بے چین ہو جاتے تھے، وہ بعض لیڈروں کی طرح اپنے غصے و ناگواری کا اظہار بے سود باتوں اور نعرہ بازی سے نہیں کرتے تھے، نہ محض وہم و تخیلات سے دل کی بھڑاس نکالتے تھے، بلکہ ان ساری طاقتوں کو عمل و تعمیر اور اس راہ کی تیاری میں صرف کرتے جس میں قوم کی مقصد براری کا امکان ہوتا تھا۔

ان کی عقل میں پختگی، فکر میں آزادی، روح میں تابانی، اور سینے میں طاقت ور ایمان موجزن تھا، اور اس شخص کی طرح کریم النفس و متواضع تھے جو اپنے مقام و منصب کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہے، ان کی زبان و قلم دونوں دل آزاری سے پاک تھے، وہ اپنے کو اس سے بالاتر سمجھتے تھے کہ تیز و چرب زبان لوگوں کا شعار اپنائیں، اور گفتگو میں تلخ لب و لہجہ اختیار کریں۔

وہ سیاست میں بھی اخلاقی قدروں کو زندہ کرنا چاہتے تھے جب کہ اس جز کو سیاست سے بالکل الگ کر دیا گیا تھا اور عام طور پر یہ کہا جانے لگا تھا کہ سیاست و اخلاق دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔

وہ ''تالیران'' کے اس قول (زبان تو اپنے حقیقی ارادوں کو چھپانے ہی کے لیے استعمال کی جاتی ہے) کو غلط ثابت کر دینا چاہتے تھے، وہ اسے قطعاً ناپسند کرتے تھے کہ سیاسی آدمی اپنے سامعین و پیروؤں اور قوم کو بہکائے اور دھوکے میں رکھے، وہ سیاسی داؤں پیچ اور پارٹیوں کے گمراہ کن طریقوں سے بلند ہو کر اس بنیاد پر کام کر رہے تھے کہ عام آدمی کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھیں اور ترقی کریں۔

بدھ کے دن وہ بڑا خوشگوار وقت ہوتا جب قاہرہ کے مختلف حصوں کے لوگ سیکڑوں کی تعداد میں ان کی باتوں کو سننے کے لیے بڑے اشتیاق کے ساتھ جمع ہوتے تھے۔ جس وقت وہ سفید قمیص اور جبہ زیب تن کیے ہوئے اور سر پر عمامہ باندھے ہوئے اسٹیج پر پہنچتے فضا نعروں سے گونج اٹھتی، وہ پہلے مجمع پر ایک باوقار نظر ڈالتے پھر باتیں شروع کر دیتے۔

ان کی تقریر سے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی ان جوابات کو سن کر جو حاضرین کے

بعض ان سوالات کے جواب میں ہوتے جو کبھی کبھی ان کی ذاتی ونجی زندگی اور خاندان سے متعلق بھی ہوتے تھے۔

شیخ حسن نے جب حکومت کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور اخبار کی گراں قدر ماہانہ یافت بھی جو سو پونڈ تھی لینا چھوڑ دیا تو لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ کا خرچ کہاں سے چلتا ہے؟ جواب میں بڑی سادگی کے ساتھ فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال سے کھاتے تھے۔ میں خدیجہ کے بھائی کے مال سے اپنا خرچ چلاتا ہوں، مراد ان کے سالے تھے، ان کی اہلیہ کا نام خدیجہ تھا۔

ان کے ''صعید'' (۱) کے پر مشقت سفر بھی حیرت انگیز تھے، یہ سفر گرمیوں کے شدید موسم میں ہوتے جب گرمی کی شدت سے لوگ بھن رہے ہوتے تھے، اس شدید گرمی میں وہ کبھی ٹرین، کبھی موٹر، کبھی جانور یا کشتی پر سفر کرتے، کبھی کبھی پیدل بھی چلتے، مگر زبان پر کبھی حرف شکایت نہ آیا۔ نہایت تحمل و بردباری کے ساتھ مشقتوں کو جھیل لیتے، نہ سورج کی لپٹ کا خیال کرتے، نہ تکلیف کی پرواہ، تیزی کے ساتھ چلتے، اپنے ساتھیوں سے باتیں کرتے ہوئے ان کی باتیں سنتے ہوئے، ایک ایک بات کو تفصیل سے بیان کرتے، اس طرح چلتے جیسے ان پر گرمی یا تکان کا کوئی اثر نہیں ہے۔ ان پُر مشقت سفروں سے جو پندرہ سال تک ہوتے رہے (اور اس مدت میں دو ہزار سے زیادہ گاؤں کا سفر کیا، اور ہر گاؤں میں کئی کئی بار جانا ہوا) انھوں نے بڑا علمی فائدہ اٹھایا، تاریخ سے واقفیت، مختلف گھرانوں اور خاندانوں کے بارے میں معلومات، ان کی لڑائی جھگڑے اور خصوصیات، پست و بالا کی خبر، وہاں کی سیاست اور شہر و دیہات میں اس کا اثر، اس سیاست سے عوام کی خوشی یا ناراضگی، شہر کے افراد و پارٹیوں، انجمنوں اور جماعتوں، وہاں کے اختلافات وکش مکش، غرض یہ کہ ہر چھوٹی بڑی چیز سے انھوں نے واقفیت حاصل کی اور فائدہ اٹھایا، بعض اوقات انھیں ایسے شہر میں جانے کا اتفاق ہوتا جہاں دو خاندانوں میں شدید اختلاف ہوتا،

---

(۱) مصر کا ایک علاقہ ہے۔

اور ہر خاندان ان سے مل کر انھیں اپنا ہم خیال بنانا چاہتا، ایسی صورت میں وہ یا مسجد چلے جاتے یا راستہ بدل دیتے۔ فریقین میں سے کوئی ان سے مل نہ پاتا، شہر میں کسی غریب مزدور کے یہاں ٹھہرتے اور وہاں لوگ ان سے ملتے۔

عوام سے اس قدر قریب ہونے کی وجہ سے ان کی واقفیت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی ان سے کہتا فلاں مثلاً حسینی یا حدیدی یا حمصانی، تو وہ کہتے کہ یہ نام تو چار پانچ خاندانوں کا ہے، ایک قاہرہ میں ہے، دوسرا دمنہور میں ہے، تیسرا زقازیق میں ہے، چوتھا فلاں جگہ ہے کہاں کا حسینی مراد ہے؟

پندرہ سال کے ان پیہم سفروں نے ان کو بہت مقبول بنادیا، مصر کے کم ہی گاؤں ہوں گے جن کے جوانوں، عوام وخواص، وزیروں، پارٹیوں کے لیڈر اور وہاں کے دیندار وصوفی لوگوں سے مل کر ان کے ذوق ورجحان سے وہ واقف نہ ہوئے ہوں، ان سفروں کے دوران وہ بہت ہی سادہ ومتواضع نظر آتے، بے تکلف جھونپڑوں میں سوجاتے، فرشِ زمین پر بیٹھ جاتے، اور جو کچھ ملتا کھالیتے، ان کو ہمہ وقت خیال رہتا کہ کہیں لوگوں کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ وہ شیخ طریقت بننا چاہتے ہیں، یا یہ کہ ان کی یہ کدوکاوش دنیاوی فوائد کے لیے ہے۔

شیخ حسن البنا نے بذات خود مجھ سے بیان کیا کہ کبھی کبھی ایسے شہر میں ان کا جانا ہوتا جہاں کوئی آشنا نہ ہوتا، وہ کسی مسجد میں چلے جاتے اور نماز بعد لوگوں سے خطاب کرتے، کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ سب لوگ اپنے گھروں کو روانہ ہوجاتے، کسی کو خیال نہ آتا کہ یہ مسافر کیا کھائے گا، کہاں رہے گا، وہ بے یارومددگار مسجد کی چٹائی پر سو رہتے، بیگ کا تکیہ بنالیتے اور عباء اوڑھ لیتے، وہ جوانوں، پڑھے لکھے طبقوں کے لوگوں اور عوام سے ملتے، ان کی سنتے، اپنی کہتے، مختلف قسم کے لوگوں سے مل کر انھوں نے گراں قدر معلومات حاصل کیں، اور اپنے علم وتجربے میں اضافہ کیا، میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانے میں حسن البنا کی مثال نہیں، وہ تاریخ مصر سے اس طرح گزرے جیسے دریا کی موجوں سے کوئی چیز تیرتی ہوئی گزر جاتی ہے اور پھر واپس نہیں آتی۔

اس تاریخ ساز شخصیت کا (جس نے وقت کے دھارے کو موڑ دیا) حضرت عمرؓ وعلیؓ اور حضرت حسینؓ کی طرح شہید ہونا ضروری تھا۔ اس لیے کہ یہ انھیں حضرات کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے۔

ان کا انتقال عین شباب میں ہوا، جیسا کہ دوسری بہت سی نادرۂ روزگار اور صاحب فکر وفن شخصیتوں کے ساتھ پیش آیا۔ ان کی صلاحیتیں دن بدن نکھرتی وچمکتی ہی جارہی تھیں کہ یکا یک ان کا چراغِ حیات گل کردیا گیا۔

اس ''مردآہن'' کو اس کے صحیح مقصد اور ستھرے فکر سے موڑنے کے لیے فریب اور بہلاوے کے سارے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے مگر اس کے پائے ثبات میں ذرا بھی جنبش نہ آئی، اور اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر صرف کرتا رہا، نہ کہیں سر جھکایا، نہ اپنے مقصد سے ذرہ برابر پیچھے ہٹا، اور نہ ہی رکاوٹوں اور دھمکیوں کے سامنے تردد وشش وپنج میں پڑا، وہ بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح کھٹکتا تھا۔

بعض لوگوں نے ان کی طاقت اور اثر ورسوخ سے فائدہ اٹھانا چاہا تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ہمارے ساتھی کرائے کے ٹٹو نہیں ہیں وہ صرف خدا کے تابعِ فرمان ہیں۔

بعض لوگوں نے ان کو اپنی جماعت میں ضم کر کے ان کے تشخص کو ختم کردینے کی کوشش کی، مگر وہ چٹان کی طرح جمے رہے، کسی دھوکے وفریب میں نہ آئے، وہ دیکھنے میں تو بڑے بھولے بھالے نظر آتے، مگر ایسے صاحبِ فراست ودوربین تھے کہ ان سے ملنے یا بات کرنے والا شخص ان کا ہم خیال اور ان کی دعوت کا قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

وہ تعرض اسی سے کرتے جو ان کی دعوت میں رکاوٹ بنتا، جو شخص ان سے اپنی مخالفت ظاہر نہ کرتا وہ اس سے اپنے کسی عمل سے تکدر و بیزاری نہ ظاہر کرتے، کسی معاملے میں جب تک اچھی طرح غور وفکر نہ کرلیتے، اس کے انجام وعواقب کو اچھی طرح سوچ نہ لیتے فی الفور کوئی فیصلہ نہ کرتے، وہ خواہ مخواہ کی باتوں میں الجھ کر اپنی طاقت نہ ضائع کرتے، بلکہ اپنی صلاحیتوں کو قوم وملک کی خدمت کے لیے محفوظ رکھتے، وہ اپنی دعوت وتحریک کو اس

سے بہت بلند سمجھتے تھے کہ وہ کسی داخلی انتشار کا سبب بنے۔ ان کے اس رویے سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ بات کمزوری ونرمی اور ہر دلعزیز بننے کی خواہش کے نتیجے میں ہے، حالاں کہ حقیقت ایسی نہ تھی، وہ علاحدگی پسندی کی بنیاد پر لڑائی جھگڑے کو قطعاً ناپسند کرتے تھے، وہ پختگی اور حصولِ کمال کی بنیاد پر دھیرے دھیرے منزل بمنزل ترقی کرنا پسند کرتے تھے۔ ان کا یہ طریقِ کار وطن اسلامی کے ان دشمنوں کو پریشانی میں ڈالتا تھا جنھوں نے انفرادی لالچ وطمع اور ذاتی اغراض ومقاصد سے بلند ہو کر کام کرنے اور ملک کی فضا کو ذاتی جذبات وخواہشات سے پاک رکھنے کا سبق ہی نہ پڑھا تھا۔

وہ مسائل کا مقابلہ کرنے میں اپنے اعصاب پر قابو رکھنے کی غیر معمولی قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ بہت ہوشیار اور حوادث ومشکلات کا بڑی سلیقہ مندی کے ساتھ مقابلہ کرنے پر قادر تھے۔

ان ساری خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ بہت ہی اعتدال پسند تھے، اپنی قلیل آمدنی پر گزراوقات کر لیتے تھے، مگر کسی کا احسان نہیں پسند کرتے تھے، ان کے ساتھی ان کے سامنے مال کا ڈھیر لگا دیتے مگر وہ قبول نہ کرتے، ان کے ساتھ ایسے بھی کارکن تھے جن کی آمدنی ان کی آمدنی سے کئی گنا زیادہ تھی، وہ شاہین کا سا حوصلہ وجگر رکھتے تھے، اس لیے شاہینی اپنا شعار بھی بنایا تھا۔

زہد وسادگی

ان کے گھر کا ساز وسامان درویشانہ، لباس نہایت سادہ، کمرے کا فرش بہت معمولی و پرانا، مگر کتابوں سے بھرا ہوا، آپ ان کے کمرے میں داخل ہوں تو ان کی آنکھوں کی اثر انگیز چمک کے سوا کوئی اور شی عام انسانوں کے معیار سے اونچی نہ ملے گی، ان کی ایک اور صفت جس میں بہت سے لوگ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، ان کی قوت گویائی ہے، وہ چند الفاظ میں ایسے اہم وطویل مسائل بیان کر دیتے جن کے لیے بڑی بڑی کتابیں بھی

ناکافی ہوں، اس بے مثال ثقافت اوران گونا گوں صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ وہ بڑے مردم شناس بھی تھے وہ بے سوچے سمجھے کسی کی راے کے خلاف کوئی رائے نہ دیتے اور نہ کوئی ایسی بات کہتے جومخاطب کے طریقۂ کارونظریے سے ٹکراتی ہو، ان کی پوری کوشش یہ ہوتی کہ نہایت حکمتِ عملی اورحسنِ تدبیر کے ساتھ مخاطب کے دل ودماغ کومتاثر کریں، اس کے بعد مخاطب کی جن چیزوں سے ان کو اتفاق ہوتا ان میں اس کی ہمنوائی کرتے اور جن چیزوں میں اختلاف ہوتا اس کو معذور سمجھتے، وہ بڑے وسیع الفکر تھے، اپنا ذہن ہمیشہ کھلا رکھتے۔ وہ آزادی راے کو ناپسند نہیں کرتے تھے اور نہ مخالف راے پر ناراض و منقبض ہوتے، کبھی کبھی انھوں نے بغیر کسی ٹکراؤ اور مخالفت کے لوگوں کے سامنے ایک نیا نظریہ پیش کیا، اور لوگوں نے تسلیم کیا حالاں کہ یہ نیا نظریہ ایسا ہوتا کہ اگر سلیقہ ودانش مندی کے ساتھ نہ پیش کیا جاتا تو لوگ ان کے مخالف ہو جاتے اور لڑ پڑتے۔ انھوں نے ان خیالات سے جو محض تقلیدی تھے یا دین کا صحیح فہم نہ ہونے کی بنا پر تھے۔ موڑ کر ان کے فکرورجحان کو بدل دیا۔ انھیں ان کا مقصد حیات سمجھا کر ان کے سینوں کو آزادی وطاقت کے جذبات سے بھر دیا۔

ان کی قائدانہ صفات میں سے ان کا وہ اسلوبِ بیان بھی تھا جس میں درد وتاثیر اور اندرونی خلش پائی جاتی تھی، وہ اپنی باتوں سے لوگوں کا دل موہ لیتے، پڑھے لکھے لوگ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے، اپنی باتوں سے مخاطب کو مطمئن کرنے کا یہ سلیقہ اور مہارت وتجربہ ان کی قائدانہ صفات کا غماز تھا۔

ان اہم خصوصیات وصلاحیتوں کی بدولت انھوں نے تھوڑی سی مدت میں ایک زبردست جماعت تیار کرلی، ان کے ہنس مکھ چہرے، نسبتاً چھوٹی داڑھی اور سادگی نے ان کو وہ وقار وتمکنت عطا کی تھی کہ جس میں نہ بعض علماء کا سا تکلف وتصنع تھا، نہ کبر ونخوت اور سادہ لوحی۔

حسن البنا کی شخصیت لوگوں کے لیے ایک نئی شخصیت تھی، جو بھی انھیں دیکھتا یا ان سے ملتا ان کا دلدادہ ہو جاتا، ان میں سیاستدانوں کی سی ہوشیاری، قائدین کی سی قوت وطاقت، علماء کے سے دلائل، صوفیہ کا سا ایمان ویقین، کھلاڑیوں کا سا جوش وولولہ، فلسفیوں

کی سی عقل، مقررین کی سی تیزی اور اصحابِ قلم جیسی پختگی تھی۔

ان کی جامع شخصیت کے یہ سارے پہلو مناسب وقت میں نئے انداز سے ظاہر ہوتے تھے۔ ان گوناگوں صفات (جو صحابہ وتابعین کے حالات میں آپ پڑھتے ہیں) کے حامل شخص کا مشرق میں زیادہ دنوں تک باقی رہنا مقدر نہ تھا، اس انوکھی شخصیت کا انوکھے انداز سے مرنا یقینی تھا، وہ ماحول ومعاشرے کے عام مزاج سے بالکل الگ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وجود ایسی بات تھی جو وقت گزرنے کے بعد کہی گئی یا ابھی اس کا وقت آیا ہی نہ تھا۔

حسن البنا جیسے شخص کے ہوتے ہوئے کہ جس نے نئے انداز سے اسلام کی آواز بلند کی اور راہ گیروں تک کو ان کے وجود اور انجام کی حقیقت سمجھا دی تھی اور لوگوں کو خدا کے نام پر جمع کر لیا تھا، مغرب ہاتھ باندھے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا، ان کی دعوت کے سامنے مغرب پرستی، اور قومیت وعلاقائیت کے رجحانات دب گئے، صحافیوں کے لب ولہجے میں اعتدال پیدا ہو گیا، اور بہت سے مغرب زدہ لوگ اسلامی فکر کے قافلے میں شامل ہو گئے۔

شیخ حسن البناؒ کا بے مثال کردار

جس وقت شیخ حسن البناؒ کی شخصیت وجود میں آئی اس وقت کوئی ایسی دعوت وتحریک نہ تھی جس کے ذریعے انھوں نے مشرق ومغرب اور ماضی وحال کو سمجھا ہو، یا اس تحریک ودعوت کے اغراض ومقاصد کو پڑھا اور جائزہ لیا ہو، پھر ان کے بانیوں کی کامیابی وناکامی کو دیکھا ہو اور اس سے اپنے مطلب کی چیزوں کو اخذ کیا ہو، غرض یہ کہ ان کے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا، بلکہ صلاحیتِ خداداد نے ان کے جوہر کو چمکایا اور پروان چڑھایا تھا۔

وہ باتوں باتوں میں سب کچھ کہہ جاتے اور ذرا بھی تکلیف ودل آزاری نہ محسوس ہوتی، وہ حکایات وقصوں کے ذریعہ تنقید کرتے، خاکہ تیار کر دیتے اور تفصیل اپنے پیروؤں پر چھوڑ دیتے۔ ہر شخص سے اس کے معیار وماحول اور اس کی خواہشات کے دائرے میں بات کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے، وہ تارِ دل اور رگِ حساس پر ضرب لگاتے اور

احساس وشعور کی آگ کو بھڑکا دیتے۔

وہ ازہریوں، یونیورسٹیوں کے طلبہ واساتذہ، ڈاکٹروں اور انجینیر وں، اہلِ تصوف اور اہلِ سنت، سب کی زبانوں اور اندازِ گفتگو سے واقف تھے۔ ڈیلٹا وصحراء اور مصر کے بالائی ودرمیانی خطوں کے اندازِ گفتگو اور رسوم ورواج تک سے واقف تھے، بلکہ قصابوں اور دیگر پیشہ والوں کی زبان سے بھی واقف تھے، وہ قاہرہ کے بعض ایسے محلوں سے اچھی طرح واقف تھے جو جداگانہ خصوصیات وعادات رکھتے ہیں، ان سے بات کرتے وقت ایسے واقعات وحکایات بیان کرتے جو ان کے ذوق وذہن کے حسبِ حال ہوتے، حتی کہ وہ چوروں، ڈاکوؤں اور قتل وغارت گری کرنے والوں تک کی زبان سے واقف تھے، ایک مرتبہ ان کے سامنے تقریر بھی کی تھی۔ وہ مختلف ملکوں اور شہروں کے دورانِ سفر وہاں کے واقعات واختلافات اور مسائل سے اپنی تقریر کا موضوع حاصل کر لیتے اور بڑی سلیقہ مندی وہوشیاری کے ساتھ اس کو اپنی دعوت اور اس کے اہم نقوش کے ساتھ جوڑ دیتے اور ایسی برمحل وحسبِ حال تقریر کرتے کہ دلوں کو جیت لیتے۔

انھوں نے اپنی تقریر میں خواہ مخواہ کی لفاظی اور چیخ چلا کر جذبات کو برانگیختہ کرنے کا اسلوب کبھی نہیں اپنایا، بلکہ عقل کو مطمئن کر کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کرتے، وہ الفاظ کے بجائے معانی سے روح کو بھڑکاتے اور وقار وسنجیدگی سے دلوں پر اثر ڈالتے، نہ کہ جوش وجذبات سے، ثبوت ودلائل سے عقلوں کو مطمئن کرتے نہ کہ لفاظی اور زوربیانی سے۔ بعض کے نزدیک ان کا اندازِ گفتگو ہی ان کا سب سے بڑا کمال تھا؛ مگر مجھے ان سے تعلق رکھنے والے بعض لوگوں سے معلوم ہوا کہ قوتِ گفتار تو نمبر۲ کی صفت تھی، لوگوں کو مطمئن کر دینا یہ ان کا سب سے بڑا کمال تھا۔ وہ ایک ایک کر کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بناتے جاتے اور انھیں اپنے سے اتنا قریب کر لیتے کہ پھر وہ کبھی الگ نہ ہوتے، ان کا ہر ساتھی اپنے آپ کو ان سے سب سے زیادہ قریب سمجھتا تھا، جس شخص سے بھی ان کا تعارف ہو جاتا اس سے مخلصانہ دوستی ہو جاتی اور اتنی بے تکلفی ہو جاتی کہ نجی مسائل تک میں

ان سے بات کرتے، جس میں کام، تنخواہ، پیشہ، خاندان اور بچوں تک کے حالات پوچھتے۔ یہ ان کی عظمت و بڑائی کا سب سے بڑا مظہر تھا۔

وہ انفرادی ملاقاتوں کے ذریعے لوگوں کو اپنا ہم خیال بناتے اور ان کے قلب ودماغ پر اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کرتے، اگر پورے طور پر لوگوں کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکتے تو اتنا تو کر ہی لیتے کہ اپنے تجربہ وزیرکی اور قوت ووقار سے ان کے فکر وعقیدہ کو بدل کر اپنے فکر وعقیدے کا قائل بنا لیتے۔ پھر وہ رفتہ رفتہ ماضی کو بھول جاتا، بلکہ اس سے بڑھ کر اس کو گناہ وغلطی تصور کرتا۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے وطن دوستی کو روحانی جذبات کا جز بنا دیا۔ وطن کی قدر ومنزلت اور آزادی کی قیمت کو بڑھا دیا؛ امیر وغریب کے مابین مساوات کو احسان نہیں، بلکہ پیدائشی حق بتایا؛ حاکم ومحکوم کے درمیان نفرت وتعاون کا جذبہ پیدا کیا، نہ کہ خادم ومخدوم کا؛ حکام وپبلک کے مابین تعلق کو فریضہ قرار دیا، نہ کہ قوت وتسلط، یہ قرآن ہی کا طرز واسلوب تھا جس کو انھوں نے نئے انداز میں پیش کیا۔

عفو وکرم، سادگی وتنظیم

میری معلومات کی حد تک شیخ حسن البنا کی تگ ودو کسی ہنگامہ آرائی یا حصولِ منصب کی بنیاد پر نہ تھی، بلکہ وہ ایک مثالی، بلند کردار، آزاد اور پختہ عقیدے کا معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے، وہ ایک ایسی نسل تیار کرنا چاہتے تھے جو مشرقی خصوصیات کی بہترین تصویر پیش کرتی ہو۔

اس صدی میں ہندوستان، مصر وسوڈان اور شمالی افریقہ وغیرہ میں بہت سی اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں، مگر وہ کوئی مستحکم وایجابی خدمت نہ انجام دے سکیں، جس کا اصل سبب یہ تھا کہ ان تحریکوں کے بانی ابتلا وآزمائش کے وقت صبر وتحمل اور حکمتِ عملی کا ثبوت نہ دے سکے، وہ قبل از وقت دوسروں پر تنقید کرنے لگے، نہ رائے عامہ کو ہموار کیا، نہ عوام سے گہرا رابطہ قائم کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے سود ہو کر رہ گئیں، نام ہی نام رہ گیا، یا صرف کتابوں

میں ان کا ذکر ملتا ہے، اب از سر نو ان کے نقوش کو زندہ کرنے اور اصول و شرائط کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔

شیخ حسن البنا نے اپنے پیش رووں کے تجربات، اور ان قائدین و مفکرین اور لیڈروں کی سرگزشت سے فائدہ تو اٹھایا، مگر ان کو اپنے لیے آئیڈیل و نمونہ نہیں بنایا، نمونہ خیر القرون کو بنایا۔ انھوں نے حضرت عمرؓ، حضرت خالدؓ و ابو بکرؓ کو اپنے لیے نمونہ بنایا۔ حضرت ابو بکرؓ سے عفو و کرم لیا، حضرت عمرؓ سے زہد و سادگی لی، اور حضرت خالدؓ سے نظم و ضبط کی اعلیٰ صلاحیتیں لیں۔

مغربی تہذیب پر تنقید

شیخ حسن البنا نے اپنی تحریک و دعوت کے لیے ایسا نقشہ بنایا جس سے دعوت کے میدان میں ایک نیا بیج بوئیں، قرآنی روح کا بیج، ایسا بیج جو پرانے درخت کے مرجھانے کے بعد بھی ہرا بھرا رہے، ان کی موت اس وقت آئی جب ان کا لگایا ہوا پودا پروان چڑھ چکا تھا اور اس کی جڑیں مضبوط ہو چکی تھیں۔

شیخ حسن البنا قرآنی تعلیمات کو اپنا شعار بنا کر ان جدید مفکرین کی راہ میں کھڑے ہو گئے جو مشرق، اسلام، اور قرآن کا مذاق اڑاتے تھے؛ وہ بڑے اعتماد و جرأت کے ساتھ لوگوں سے کہتے کہ اب جب کہ خود اہل مغرب کی نظر میں مغربی تہذیب ان کے مقاصد کو پورا کرنے سے قاصر نظر آرہی ہے، تو ہم کو اہل مغرب کے افکار کو خوب اچھی طرح جانچ پرکھ کر اپنانا چاہیے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں اچھی طرح دیکھ بھال کر یہ یقین کرنا چاہیے کہ ہماری اسلامی قدریں مغرب کی قدروں سے کم نہیں ہیں، یا کم از کم درجہ یہ ہے کہ ان اسلامی قدروں سے تغافل و لاپروائی نہیں برتی جا سکتی؛ مشرق کے لیے ضروری ہے کہ دنیا کے سامنے اس تہذیب کو پیش کرے جو مغربی تہذیب سے کہیں زیادہ بہتر ہو، اور اس کا مزاج و جوہر، روح کا مادے سے اور آسمان کا زمین سے رشتہ قائم کرنا ہو، ان کے سامنے مغربی تہذیب کی جو چیز بھی پیش کی جاتی وہ اس کو قرآن و سنت، اسلامی تہذیب اور تاریخ اسلام کی کسوٹی پر جانچتے:

ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اسلام ایک نفسیاتی طاقت ہے جو مشرق کے ضمیر میں موجود ہے، یہ طاقت اس کو ایسی زندگی عطا کر سکتی ہے جو اس کو روئے زمین پر قوت واقتدار عطا کرے اور اپنے مرکزِ اصلی کی طرف آنے کا موقع فراہم کرے اور اس کے کھوئے ہوئے حقوق و آزادی کو بحال کرے، ان کا یہ خیال تھا کہ مشرق ایک مکمل و نا قابلِ انکار وحدت ہے۔

شیخ حسن البنا موت سے نہیں ڈرتے تھے

شیخ حسن البنا اپنی جادو بیانی، شیریں کلامی اور سنجیدہ، باوقار گفتگو کی طاقت سے ایک زبردست جماعت تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے، یہ عظیم جماعت، مختلف جماعتوں، پارٹیوں اور صوفیہ کے حلقوں سے کٹ کر حسن البنا کے جھنڈے تلے جمع ہوگئی اور ان پر پورے اعتماد واطمینان کا اظہار کیا، شیخ حسن البنا کی اس مقبولیت نے حاسدین کے حسد کو بھڑکا، دیا حتی کہ بعض پڑھے لکھے لوگوں کے اندر بغض وکینہ پیدا ہوگیا، اور یہ ایک طبعی بات تھی کہ یہ بے توفیق لوگ اس درویش وفقیرِ بے نوا پر حسد کریں جس نے نہایت بے سروسامانی کے عالم میں محض اپنی سلیقہ مندی و دردسے لوگوں کا دل موہ لیا، اور ان کو مادی لالچ کی اس سطح سے بہت بلند کر دیا جس کے سبب عام طور پر لوگ مادے پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔

ایسی صورت میں کچھ لوگوں کا ان سے ناراض ہونا، اور ان کے خلاف افواہیں پھیلانا ایک طبعی بات تھی، ان جاہ پسندوں کے لیے اس سے زیادہ سخت اور کیا بات ہو سکتی تھی کہ کوئی ان کے اقتدار کو چھین لے، یہ بات ان کے حلق سے کیسے اترتی کہ انھیں میں کا ایک شخص اٹھے اور اسلام وقرآن کے نام پر لوگوں کو اپنے گرد جمع کرلے اور ان سے کہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب کے حقوق یکساں بنائے ہیں، ان کے نزدیک فضیلت وبرتری کا معیار حسنِ عمل، تقویٰ اور خوفِ خدا ہے۔

شیخ حسن البنا کے ان عجیب وغریب حالات کے ساتھ ان کے خلاف شکوک وشبہات اور غلط پروپیگنڈے کا جو طومار لگا دیا گیا ہے، اس کے پیش نظر میرا یہ خیال تھا کہ ان کے بارے میں تاریخ کے حقیقت پسندانہ بیان اور مورخ کی بے لاگ رائے کو سامنے آنے

کے لیے ایک عرصہ گزر جانا ضروری ہے، مگر مصر کے سیاسی حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ بعض مسائل کی تحقیق نے اخوانیوں پر لگائے گئے الزامات و بہتان تراشیوں کا پردہ فاش کر دیا، اور شیخ حسن کی پوزیشن بہت صاف ستھری اور ہر بدگمانی سے پاک ہو کر سامنے آ گئی۔

میں شیخ حسن البنا سے ۱۹۴۶ء میں قاہرہ میں ملا تھا پھر ۱۹۴۹ء میں جب دوبارہ قاہرہ آیا تو وہ شہید کیے جا چکے تھے، میں نے ان بعض حلقوں سے جن سے میں واقف تھا رابطہ قائم کیا اور ان لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں تو اس وقت میں نے بہت سی وہ باتیں سنیں جنھوں نے میرے پہلے خیال کی تصدیق کی۔

مجھے معلوم ہوا کہ اخیر دنوں میں ان کو اپنی شہادت کا اندازہ ہو گیا تھا، ان کے بہت سے بہی خواہوں نے ہجرت، فرار، یا توریہ و تقیہ کا مشورہ دیا، مگر وہ ان مشوروں کو سن کر مسکرا دیتے اور یہ قدیم شعر پڑھتے۔

أي يوم من الموت أفر يوم لا قدر أم يوم قدر
يوم لا قدر لا أرهبه ومن المقدور لا ينجو الحذر

میں کس دن موت سے بھاگوں؟ جس دن مقدر نہیں ہے یا جس دن مقدر ہے، جس دن موت مقدر نہیں اس دن سے ڈرتا نہیں ہوں، اور جس دن مقدر ہے اس دن سے بھاگنا اور بچنا بے سود ہے۔

وہ اپنے ساتھیوں کو قید و بند سے رہائی دلانے کے سلسلے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے، اپنی پوری کوشش صرف کر دیتے، **ان کا حال یہ تھا کہ رات کو اٹھ کر بیٹھ جاتے اور اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہتے ''میں ان بچوں کے رونے چلانے کی آوازیں سن رہا ہوں جن کے سرپرست جیلوں میں قید ہیں''۔**

یوں تو اس مردمومن کی تاریخِ جہاد بہت طویل ہے لیکن میدانِ عمل میں ان کا کامیاب ترین زمانہ جنگ کا زمانہ ہے، جب وہ ۱۹۳۶ء میں جیل سے باہر آئے، یہ وہ نازک زمانہ تھا جب جنگ کی سنگین صورت حال نے سارے عالم کو سیاست، پارٹی اور منصوبہ بندی سے بے خبر کر دیا تھا، کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہا تھا، ان نازک ترین گھڑیوں

اوراس نفسی نفسی کے عالم میں بھی شیخ حسن البنا چین سے نہ بیٹھے، برابر دوڑ دھوپ اور ادھر ادھر کے سفروں میں مشغول رہے، کبھی چین کی نیند نہ سوئے، وہ ہر گاؤں اور قصبے میں جاتے، ایک ایک خیمے میں جا کر تو جوانوں، بوڑھوں، علماء اور اعیان سے ملتے اور ان سے باتیں کرتے، اپنا دردِ دل سناتے، اور خطروں سے آگاہ کرتے، ان خطروں سے جو جنگ سے بھی زیادہ خطرناک تھے، انھوں نے وزراء تک کو متاثر کیا، حتی کہ بعض نے تو ان کے زیر قیادت اوران کے لشکر کی ماتحتی میں آجانے کا اعلان کردیا، انگریزوں نے تاڑلیا کہ شیخ حسن البنا کی ذات ان کے لیے زبردست خطرہ ہے۔ چناں چہ ان کو اپنے دامِ فریب میں لانے کے لیے انھوں نے بڑے بڑے ڈورے ڈالے اور للچادے دیے مگراس شخص کے پائے ثبات میں ذرا بھی جنبش نہ آئی، پارٹیاں صلح کے انتظار میں میٹھی نیند سوگئیں، مگر یہ مردِ آہن بیس بیس گھنٹے کام کرتا رہا، نہ تھکتا، نہ ہمت ہارتا، ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے اس کے اعضاء واعصاب فولاد سے بنے ہیں۔

ان کو اپنے فکر ونظریے سے ایسا عشق تھا کہ بیان سے باہر ہے، ان کے دل میں کوئی ایسی خواہش نہ جنم لینے پاتی جو ان کی دعوت سے ٹکراتی ہو، اپنے مشن سے ان کو ایسا عشق تھا جیسے کسی کو ماہ روحسینہ سے ہوتا ہے، وہ نہ جاگنے سے گھبراتے، نہ سفر سے تھکتے، عقل وخرد ایسی بلا کی پائی تھی کہ ہر مشکل ان کو آسان معلوم ہوتی، نہایت نازک اور پیچیدہ ترین صورت حال کو چٹکیوں میں سلجھالیتے، بڑی سنجیدگی وخاموشی کے ساتھ مسائل کو حل کرلیتے۔ کسی بات کو سمجھنے کے لیے طویل گفتگو کی ضرورت نہ پڑتی، ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ہر معاملے سے پہلے سے واقف اوراس کے لیے تیار ہیں۔ بات کرنے والا ایک ہی دو جملے بولتا کہ وہ اس کے مقصد ومنشا کو سمجھ جاتے، بلکہ کبھی کبھی تو بولنے سے قبل ہی مقصود کو سمجھ جاتے اور مخاطب جو پوچھنا چاہتا اس کو اس کا جواب مل جاتا، بلا کا ذہنِ رسا پایا تھا، وہ آثار وقرائن سے حقیقت تک پہنچ جاتے، اس بارے میں تو ان میں خدا کی قدرت کا جلوہ نظر آتا تھا۔

وہ ہر چیز کو اچھی طرح ہضم کرلیتے، علم وفکر، قانون ومعاشرت اور سیاست وادب کا کوئی نیا نظریہ ایسا نہ تھا جس کو اس مردِ مومن نے پڑھا نہ ہو، اوراس سے اچھی طرح واقفیت نہ رکھتا ہو!

جب میں نے حسن البنا سے مشرق کے اندر اسلام کی ترقی کے امکانات کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ مشرق کا مزاج دینی ہے، مثال کے طور پر ترکی کے بارے میں کہتا ہوں کہ وہ عنقریب اسلام کی طرف لوٹے گا، اور اب اس کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں۔ ہماری ان کی یہ گفتگو ۱۹۴۶ء میں ہوئی تھی، آنے والے دنوں میں میں نے وہ حالات دیکھے جن سے شیخ حسن البنا کے قول کی تصدیق ہوئی، مئی ۱۹۵۰ء میں جب کہ شیخ شہید ہو چکے تھے، مصطفیٰ کمال کی پارٹی ہار گئی اور وہ پارٹی برسر اقتدار آ گئی جس کو رجعت پسند کہا جاتا تھا (یعنی اسلام پسند)۔

میں نے ان سے تصوف وصوفیہ کے بارے میں سوال کیا کہ کیا یہ بھی اسلام کا جز ہے۔ یہ سوال میں نے ان سے اس لیے کیا کہ بعض رسالوں میں ایک مضمون شائع ہوا کہ شیخ مغرب کے طریقۂ شاذلیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شیخ نے جواب میں فرمایا کہ خالص تصوف جو غلو سے پاک ہو وہ تو اسلام کی اصل روح ہے، یہ اسلام کا وہ درجہ ہے کہ مخلص وحق پرست ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ حقیقی تصوف انسان کے اندر جہاد ومقابلے کی روح اور اپنے فکر ونظریے کو اسلامی حقائق کے سامنے ہیچ سمجھنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے، میری خواہش ہے کہ میرے ساتھی اس مقام کو حاصل کر لیں، اخوانیوں کے لیے اس میں کوئی حرج نہیں کہ مظاہرِ تصوف کے پسِ پردہ جو گہری حقیقتیں پوشیدہ ہیں ان کو اپنائیں اور دعوت میں شامل کریں، اس کے پرانے لباس یا ان مظاہر کو جو موجودہ زمانے سے میل نہیں کھاتے اس کے پابند نہ ہوں۔

جب میں نے ان سے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ تمام لوگوں کا ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا خصوصاً اس صورت میں جب کہ خود اسلامی مسائل میں اختلاف ہے بہت مشکل ہے، تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ اختلافات مسلمانوں کے اتحاد میں رکاوٹ نہیں بنیں گے، بلکہ یہ اختلافات تو اسلام کی وسعت اور ہر ملک وزمانے کا ساتھ دینے کی اسلامی قدرت وصلاحیت کا ثبوت ہیں، ہمارا یہ اختلاف دین کی فروعی وجزئی چیزوں میں ہے اور اس کا ہونا ضروری ہے، اس میں بڑی حکمت وخیر پوشیدہ ہے۔ خلیفہ ابو جعفر منصور نے جب امام مالکؒ سے ایک ایسی کتاب لکھنے کا مطالبہ کیا کہ جس پر سارے مسلمان متفق ہوں تو امام مالکؒ نے

جواب دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ مختلف شہروں میں پھیل گئے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک تعلیمات نبوی کا الگ ذخیرہ ومعلومات رکھتا ہے، اب اگر آپ ان کو ایک ہی رائے ومسلک پر جمع کرنا چاہیں گے تو انتشار وفتنہ پیدا ہوگا، اس لیے کہ مسائل کی تطبیق حالات وماحول کی رعایت کرتے ہوئے بدل جاتی ہے۔ امام مالکؒ نے مصریوں کے لیے جو فتویٰ دیا وہ اس فتوے سے مختلف تھا جو عراقیوں کے لیے دیا۔ انھوں نے دونوں شہروں کے حالات کو مدنظر رکھ کر الگ الگ مسئلے بتائے؛ لہٰذا جزئی مسائل میں اجماع کی خواہش امر محال اور اسلامی مزاج کے خلاف ہے۔

یہ جزئی اختلاف دلوں کو جوڑنے اور ایک دوسرے سے محبت کرنے میں مانع نہیں، اخوان تو اپنے مخالفین کے لیے بڑے وسیع القلب ہیں۔

میرا خیال تھا کہ دین وسیاست دونوں جمع نہیں ہو سکتے، لیکن جب میں نے اپنے اس خیال کو شیخ حسن البنا سے بیان کیا اور پوچھا کہ کیا دین وسیاست دونوں کا اجتماع ممکن ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ سیاست کے بغیر اسلام صرف نماز اور چند الفاظ کے مجموعے کا نام رہ جائے گا، جس کا زندگی کے مسائل سے کوئی تعلق نہ ہوگا، اسلام درحقیقت وطن وعقیدہ بھی ہے اور قوم وسیاست بھی، تہذیب وثقافت بھی ہے اور قانون وضابطۂ حیات بھی، اگر اسلام کو سیاست سے الگ کر دیا جائے تو وہ بہت تنگ دائرے میں محدود ہو جائے گا، اس میں چند رسوم ورواج اور ایک بے روح ڈھانچے کے سوا کچھ نہ رہ جائے گا۔

انھوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ مغرب کے غلبہ وکامیابی کا راز بھی اسلامی قدروں میں مضمر ہے، میں نے بڑی حیرت سے پوچھا: وہ کیسے؟ تو انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا: دو پہلوؤں سے، مغرب نے اپنی پرانی قدروں کو تو محفوظ رکھا اور جب قرطبہ وقسطنطنیہ کی ثقافت سے فائدہ اٹھا کر اس کو یورپ کے حوالے کیا تو وہ اور چمک گئی، مغرب مشرق ہی کے اخلاق واصولوں کے سہارے غالب آیا۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ ہوشیار مغرب نے یہ تاڑ لیا کہ ان اخلاق نے مشرق کو کس طرح ترقی کے بام عروج کو پہنچایا، چناں چہ انھوں نے مشرق کے ان اخلاق کو اپنا کر جن سے خود مشرق تغافل برتنے لگا تھا، یہ عظیم

سلطنت قائم کر لی۔ سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے انھوں نے مزید کہا کہ اس وقت مشرق میں آپ اسلام کے نام سے جو کچھ دیکھ رہے ہیں یہ حقیقی اسلام نہیں ہے، یہ تو محض نام کے مسلمان ہیں جو خاندانی طور پر مسلمان چلے آرہے ہیں، حالاں کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر یہ اپنی حقیقت کو سمجھ جائیں تو منزل مقصود تک پہنچنا آسان ہو جائے!

شیخ حسن البنا نے جب شروع شروع میں حجاز کا سفر کیا اور وہاں کام کرنا شروع کیا تو اس وقت ان کی مقبولیت کی جو کیفیت تھی اس کو ان کے بعض ساتھیوں نے مجھ سے بیان کیا، ان لوگوں نے بتایا کہ ان کی قیام گاہ پر ہندوستان، جاوا، سری لنکا، مڈغاسکر، بورنیو اور نائجیریا، کیمرون وانڈونیشیا، ایران وافغانستان سے آنے والے مسلمانوں کے وفود کا ہجوم ہوتا تھا، اور وہ ہر وفد کے حسب حال اس کے ملک کی نزاکتوں اور ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس طرح بات کرتے تھے کہ جیسے خود مشاہدہ کر کے آئے ہوں، ان کی باتیں سن کر وفد کے لوگ اس حیرت انگیز واقفیت پر ششدر رہ جاتے تھے۔

بعض وقت ان کی جماعت کے بعض اشخاص آتے اور بڑی آرزدہ خاطری کے ساتھ ان سے مخالفین کے لعن طعن اور ناملائم طرزِ گفتگو کا ذکر کرتے، ان کی باتیں سن کر شیخ حسن بڑی سنجیدگی سے فرمادیتے کہ تم ان کے کہنے کی کوئی پروا نہ کرو، اپنا کام کرتے رہو اور ان سے اچھا سلوک کرو، سب سے زیادہ حیرت کا وقت وہ ہوتا جب وہ اپنے پیروؤں کے سامنے خلوص وایمان اور ایثار وقربانی کے موضوع پر تقریر کرتے، یہاں میں اس کے چند نمونے پیش کرتا ہوں۔

۱۔ ’’ہمیں اپنے اسلامی وطن کا راستہ معلوم ہو گیا ہے، وہ ہے جہاد و جواں مردی اور جذبۂ شہادت وقربانی، ہر وقت و ہر زمانے کے مخلص مسلمانوں نے اسی راہ کو اپنایا ہے‘‘۔

۲۔ ’’اس وقت سارا عالم بھٹک رہا ہے اور اسے راہ نہیں ملتی، وہ حق اور اعلیٰ قدروں کی تلاش میں ہے، مگر یہ اس کو موجودہ فلسفوں، اصولوں، اور اپنے خود ساختہ نظاموں میں نہیں پاتا، انسانیت کے درد کا درماں تو تمھارے زبردست پیغام اسلام ہی میں ہے، تم اس کی روشنی میں انسانیت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحلِ نجات سے ہم کنار کرو اور اسے

غیروں کے تسلط سے چھڑاؤ"۔

۳- "مشرق اس وقت نشاۃ ثانیہ اور زبردست ترقی کی تیاریوں میں لگا ہوا ہے، اور مغرب اس تاک میں ہے کہ اس کو بڑھنے نہ دے، لہٰذا ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ تہذیب انسانی کی قیادت کا جھنڈا ہم اپنے ہاتھ میں لے لیں، لوگوں کی رہنمائی کریں اور ان کو مغرب کے پھندے سے آزاد کرائیں، اب مغرب ناکام ہو چکا ہے اور اسے راہ نہیں سجھائی دے رہی ہے"۔

۴- "اس وقت سارا عالم حیران و سرگرداں ہے، اس کی نگاہیں قیادت کی طرف لگی ہوئی ہیں اور صحیح قیادت کی جگہ خالی ہے، اس کو تمھارے سوا کوئی دوسرا نہیں پُر کر سکتا؛ اس لیے کہ تم نے امن و سلامتی، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، حق کو عملی جامہ پہنانے اور انسانیت کو آزاد کرانے والے اس پیغام کو مانا اور قبول کیا ہے جس کا تعلق آسمان سے ہے، وحی الٰہی سے ہے"۔

ایک اور چیز جس نے میری نگاہوں کو اس شخص کی طرف متوجہ کر لیا، وہ تھا ذاتی اختلاف و لڑائی اور فکری اختلاف و لڑائی کا فرق۔ اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں سے ہمارے اختلاف کی بنا ذاتی نہیں ہے اور نہ ہوگی، ہمارے ان کے اختلاف کی بنا فکر و نظام ہے، وہ لوگ حکومت و سیاست، عدالت و تعلیم اور اقتصادیات و تمدن کے اندر مغرب کی تقلید میں مسخ شدہ اجتماعی نظام لانا چاہتے ہیں اور ہم اسلامی تعلیمات و احکامات کا صاف ستھرا خدائی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اگر ہم حقیقتِ اسلام کو اس طرح سمجھنا چاہتے ہیں جس طرح شیخ حسن البنا نے سمجھا تھا، تو ان کو حضرت عمرؓ کے نقوش کے آئینے میں دیکھنا چاہیے، وہ اسلام کو ایسا ہی سمجھتے تھے جیسے حضرت عمرؓ نے سمجھا تھا، وہ حضرت عمرؓ ہی کے الفاظ میں کہتے ہیں "اذا أحسنت فأعينوني واذا أسأت فقوّموني" اگر میں صحیح اور ٹھیک کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر غلطی کروں تو مجھے درست کرو۔

وہ اسلام کو اس طرح جاری کرنا چاہتے تھے جس طرح ابوبکرؓ نے فرمایا اور جاری کیا تھا، وہ حضرت ابوبکرؓ ہی کی زبان میں فرماتے ہیں "الضعيف عندي قوي حتى آخذ

الحق له، والقوي عندي ضعيف حتى آخذ الحق منه، وأطيعوني ماأطعت الله فيكم، فاذا عصيته فلاطاعة عليكم" کمزور میرے نزدیک قوی ہے، تا آں کہ اس کو اس کا حق نہ دلا دوں، اور طاقت ور میرے نزدیک کمزور ہے، جب تک اس سے دوسرے کا حق نہ دلا دوں، تم اس وقت تک میری بات مانو جب تک میں خدا کا فرماں بردار ہوں، اور اگر میں خدا کی نافرمانی کروں تو پھر تم کو میری پیروی کرنا قطعاً درست نہیں، اگر تم کلمۂ حق نہ کہو گے تو تم میں کوئی خیر نہ ہوگی، اور اگر میں اس کلمۂ حق کو نہ مانوں تو مجھ میں کوئی خیر نہیں۔

شیخ حسن البنا حاکم کی ذمہ داری کو حضرت عمرؓ کے اس قول کے آئینے میں دیکھتے تھے "لومات جَدْيٌ بطف الفرات لظننت أن الله عزوجل سائلي عنه يوم القيامة" اگر ساحل فرات پر بھی کوئی بکری کا بچہ ضائع ہوگیا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مجھ سے باز پرس فرمائے گا۔

وہ حاکم کو انصاف پر قدرت واختیار کے سلسلے میں جس میں انسانی کمزوری شامل ہوتی ہے، حضرت عمرؓ کے اس قول کے معیار پر تولتے تھے "أصابت امرأة وأخطأ عمر" ایک عورت نے بات کو ٹھیک سمجھا، عمر نے غلطی کی۔

وہ عدالت میں حضرت عمرؓ کے اس نظامِ عدل کو جاری کرنا چاہتے تھے کہ "اجعل الناس عندك سواء، لاتأخذك في الله لومة لائم، واياك والأثرة والمحاباة فيماولّاك الله" تم لوگوں کو برابر سمجھو، اللہ کے بارے میں ملامت کرنے والوں کی ملامت کا خیال نہ کرو، خدا نے تمھیں جس معاملے کا مختار وحاکم بنایا ہے اس میں خودغرضی وامتیاز برتنے سے بہت دور رہو، کئی کئی بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کو دہراتے، جو آپ نے حضرت اسامہ سے اس وقت فرمایا تھا جب انھوں نے چوری کرنے والی ایک عورت کی سفارش کی تھی۔ "أتشفع في حد من حدود الله، والله لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها" تم اللہ کی حدود کے بارے میں سفارش کرتے ہو، خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتا۔

وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی زندگی کو حضرت عمرؓ کے اس جاوداں کلمہ کے مطابق

ڈھال لیں "أحب من الرجل اذا سيم الخسف أن يقول ولا بملأ فيه" میں چاہتا ہوں کہ مومن پر خواہ کیسا ہی ظلم کیا جائے اور اس کو کلمۂ باطل کو قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، وہ بہرحال پوری طاقت سے اس کا انکار کردے"۔

حسن البنا نئی نسل کی تربیت، اسلام کی ان اعلیٰ قدروں کے مطابق کرنا چاہتے تھے اور اس کے مطابق اپنا دستہ تیار کررہے تھے، وہ ایسا خاکہ تیار کررہے تھے کہ اگر وہ عملی شکل میں وجود میں آجائے تو اسلام مشرق میں اپنا صحیح رول ادا کرسکے اور زبردست قیادت اور انسانیت کی بہتری و کامیابی کے رخ کو اپنائے۔

وہ وسائل وذرائع سے قطعِ نظر کرکے مقاصد پر نظر رکھتے تھے، حاصل کلام یہ کہ شیخ حسن البنا اسلام کو بہت اچھی طرح اور مطابقِ فطرت سمجھتے تھے، بالکل اسی طرح جس طرح مجھ سے گفتگو کرتے وقت ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ میرے نزدیک اسلام وہ ہے جس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے برتا اور امت کو بتایا ہے"۔

شیخ حسن البنا میرے نزدیک قریب قریب امام ابوحنیفہؒ کے درجے کے آدمی تھے جنھوں نے عہدۂ قضا کو ٹھکرادیا تھا، وہ امام مالک کا سا مرتبہ رکھتے تھے، جنھوں نے بیعت کے بارے میں نہایت جرأت مندی کے ساتھ فتویٰ دیا، وہ امام احمد بن حنبل کی ہمسری کررہے تھے جن سے حکومت کے منشا کے مطابق فتویٰ دینے کو کہا گیا تو بے تامل انکار کردیا۔

شیخ حسن البنا نے اپنے کو جھوٹی عزت وشہرت کی کشش سے آزاد کرلیا تھا۔ مشہور فلسفی کی نظر میں اس درجے کی خودداری وآزادی انتہائی درجے بہادری وکمال ہے، اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ وہ ان سطحی چیزوں کو خاطر میں لائیں، اپنے دوسرے کمالات کی طرح وہ اس بارے میں بھی بہت فائق ومنفرد تھے۔

لیڈروں کے گروہ میں شیخ حسن البنا منفرد ویگانہ تھے، لہٰذا ان کی موت بھی سب سے نرالی ہوئی۔ رات کی تاریکی میں قتل کیے گئے....ان کے والد نے نماز جنازہ پڑھی اور گھر کی عورتوں نے جنازہ کو کاندھا دیا، اس لیے کہ ان کے تمام ساتھی وہمنوا تو جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھے۔ شہادت کے بعد راتوں رات دفن کیے گئے۔ گھر والوں کو اس حادثۂ جانکاہ

کے اعلان واطلاع کی بھی اجازت نہ ملی، تنہا ان کے والد نے غسل دیا۔ اس رات قاہرہ پر نہایت خوف وہراس کی فضا چھائی تھی، یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی، جو شخص ظلم وجور اور باطل سے ٹکرائے، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور ابن تیمیہؒ کے راستے پر چلے، حالات سے لڑے اس کی موت تو ایسے ہی انوکھے، خوفناک اور انتہائی دردناک صورت میں آنی چاہیے تھی، جب ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ مخالفین کے دل دہلاتا تھا، تو یہ بھی ضروری تھا کہ ان کی موت بعد کی نسلوں کا دل دہلاتی رہے، ایسے لوگوں کے جنازے میں ہزاروں ہزار کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے جن کی قیادت محض ڈھول کا پول اور سراسر غلط تھی، تو کیوں نہ شیخ حسن البنا کی ذات اس نقالی سے بری ہوتی جس کی بنیاد نفاق پر ہے!

تاریخ کو فریب دینے والوں، اور اللہ ورسولؐ کے نام پر اخلاص کے ساتھ کام کرنے والوں کا یہ فرق تو ازل سے چلا آرہا ہے۔

شیخ حسن البنا کی موت کا یہ حیرت انگیز انداز، دعوت کے میدان میں کام کرنے والوں کے دلوں کو مدتوں نور وتابندگی عطا کرتا رہے گا، اور اس عزم کے ساتھ جو لوگ راہ حق پر چلیں گے ان کے دلوں میں وہی قوت وتوانائی پیدا کرتا رہے گا جو حق اپنے پیروؤں کے دلوں میں پیدا کرتا ہے، حتی کہ وہ حق پر جم جاتے ہیں۔

شیخ حسن البنا کی شہادت حضرت حسینؓ کی شہادت سے ملتی جلتی ہے، دونوں کے عوامل مختلف، مگر فکر ومقصد ایک ہی ہے۔

ان کے بارے میں جب عدالت فیصلہ کرنے سے قاصر رہی تو تقدیر نے اپنا فیصلہ نافذ کردیا، مگر میرے ذہن میں اٹھنے والے جس سوال کا جواب نہیں ملتا وہ یہ کہ کیا اس اسلام کا جس کو حسن البنا سمجھتے تھے اور اس کی دعوت دیتے تھے، اس اسلام سے کوئی دور کی مناسبت ہے جس کی اور بہت سے لوگ دعوت دیتے ہیں اور محض نام کے مسلمان ہیں؟ کیا شیخ حسن البنا اور ان لوگوں کے اسلام میں کوئی فرق ہے۔ میرے ذہن میں اٹھنے والے اس سوال کا مجھے کوئی جواب نہ مل سکا اس لیے اس کو تاریخ پر چھوڑتا ہوں!!

ضمیمہ-۱

اخوان المسلمون کا اسلام

(اخوان کا تعارف اس کے بانی کی زبانی)

[یہ مضمون شیخ حسن البنا کے مجموعۂ رسائل میں موجود ہے نیز توفیق الواعی کی کتاب ''حسن البنا مجدد القرن''، میں بھی شامل ہے۔ ہم نے یہ ترجمہ ''مجاہد کی اذان'' سے کچھ ترمیم کے ساتھ لیا ہے]

معزز دوستو! برا نہ مانو، مجھے یہ کہنے کی اجازت دو، میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ اخوان کا کوئی نیا اسلام ہے، اُس اسلام سے مختلف جو ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔ میرا مدعا بس یہ ہے کہ مسلمانوں نے بعد میں خود اپنی طرف سے اسلام کو بہت سی صفات وخصوصیات اور تعریفات وتصورات کے جامے پہنا دیے، اور اس کی نرمی، وسعت اور لچک کا نہایت غلط استعمال کیا، ورنہ اس کے اندر تو بڑی حکمت تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ تصورِ اسلام میں زبردست اختلاف ہوا اور دِلوں میں اسلام کی مختلف تصویریں نقش ہو گئیں، جو اس اسلام کے مطابق یا کچھ مشابہ یا اس سے بالکل ہی مختلف تھیں جس کی بہترین تصویر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ نے پیش کی تھی۔

چناں چہ کچھ لوگوں کے نزدیک بس عبادت کی کچھ ظاہری شکلوں کا نام اسلام ہے۔ اگر انھوں نے وہ شکلیں اختیار کر لیں، یا کسی کو اختیار کیے ہوئے دیکھ لیا تو وہ مطمئن ہو گئے۔ سمجھ گئے کہ انھوں نے اسلام کی روح پالی۔ عام مسلمان اسی تصورِ اسلام سے آشنا ہیں۔

کچھ لوگوں کے نزدیک اسلام اس کا نام ہے کہ اخلاق اچھے ہوں اور روحانیت،

جو عقل و روح کی مرغوب ترین علمی غذا ہے، پورے جوش پر ہو، اور ظالم و سرکش مادیت کی آلائشوں سے پاک ہو۔

کچھ لوگوں کی پرواز بس اس حد تک ہے کہ وہ اسلام کے جان دار عملی نظاموں کو تحسین و عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور چیز دیکھنے کے وہ روادار نہیں، نہ کسی اور مسئلے پر کچھ سوچنے کے لیے وہ تیار ہیں۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اسلام کو چند فرسودہ عقائد اور تقلیدی اعمال کا مجموعہ سمجھتے ہیں، جن کے اندر کوئی افادیت نہیں، نہ ان کے ہوتے ہوئے ترقی کا کوئی امکان ہے۔ چناں چہ وہ اسلام اور اسلام کی تمام باتوں سے دل برداشتہ ہیں۔

یہ کیفیت واضح طور پر ان لوگوں میں نظر آئے گی جو مغربی کلچر یا مغربی ثقافت کی آغوش میں پلے ہیں، جنھیں صحیح طور سے اسلامی حقائق سے وابستگی کے مواقع میسر نہیں ہوئے۔ لہٰذا انھوں نے سرے سے اسلام کو سمجھا ہی نہیں، یا وہ ایسے مسلمانوں کے ساتھ رہے جنھوں نے اسلام کی اچھی تصویر نہیں پیش کی۔ اس طرح انھوں نے اسلام کی بگڑی ہوئی اور مسخ شدہ تصویر ہی دیکھی۔ اچھی اور دل کش تصویر دیکھی ہی نہیں۔

پھر ان کے تحت بھی بہت سی قسمیں ہیں جن میں سے ہر ایک کا تصورِ اسلام دوسروں کے تصورِ اسلام سے کم و بیش مختلف ہے؛ بس کچھ ہی نگاہیں ایسی ہوں گی جو اسلام کے حقیقی جمالِ دل ربا سے آشنا ہوئی ہوں گی۔

چوں کہ ایسی ہی اسلام کی یہ متعدد تصویریں ذہنوں میں بیٹھی ہوئی ہیں، اس لیے اخوان کو سمجھنے میں بھی ان کے درمیان نمایاں اختلاف ہوا، کچھ لوگ تو اخوان کو محض ایک تبلیغ و نصیحت کرنے والی جماعت سمجھ بیٹھے جسے لے دے کہ بس یہ فکر رہتی ہے کہ وہ کچھ نصیحتیں کر دے اور آخرت کی یاد تازہ کر کے دنیا سے بے رغبتی پیدا کر دے۔ کچھ لوگ اخوان کو تصوف کا ایک طریقہ سمجھتے ہیں جو لوگوں کو ذکر و اذکار اور مختلف عبادتوں کا عادی بناتے ہیں اور زہد اور دنیا سے بے رغبتی کی تعلیم دیتے ہیں۔

کچھ لوگوں کا گمان یہ ہے کہ وہ ایک نظری اور فقہی جماعت ہے جس کا کام بس یہ ہے کہ وہ کچھ فقہی مسائل میں جھگڑے، بحث مباحثہ کرے، انھیں اپنا مسلک ماننے پر مجبور کرے اور جو تسلیم نہ کرے، اس سے دست و گریباں ہو جائے یا کچھ مصالحت کرلے۔

بس کچھ ہی لوگ ایسے ہیں جنھوں نے محض دور سے سننے پر اکتفا نہیں کیا، نہ اپنے مزعومہ تصورِ اسلام کا جامہ ان پر چست کیا، بلکہ ان سے قریب ہوئے کچھ گھلے ملے، نزدیک سے ان کی حقیقت پہچانی، علمی و عملی طور پر ان کی دعوت سمجھنے کی کوشش کی۔

اسی لیے میں نے چاہا کہ آپ کے سامنے مختصراً اسلام کا مفہوم اور اس کی وہ تصویر پیش کردوں جو اخوان کے ذہنوں میں ہے، تاکہ وہ اساس جس کی ہم دعوت دیتے اور جس سے فیض یاب ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں وہ بالکل واضح اور روشن ہو۔

ا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات بہت جامع اور دنیا و آخرت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں۔ اور جن لوگوں کا گمان یہ ہے کہ وہ محض عبادات سے تعلق رکھتی یا خالص روحانی پہلوؤں سے بحث کرتی ہیں، ان کا گمان سرتاسر غلط اور وہم کا شکار ہے۔ کیوں کہ اسلام عقیدہ بھی ہے، عبادت بھی ہے، وطن بھی ہے، قومیت بھی ہے، دین بھی ہے، حکومت بھی ہے، عمل بھی ہے، روحانیت بھی ہے، قرآن بھی ہے، تلوار بھی ہے، قرآن کریم ان تمام باتوں کا اعلان کرتا ہے، وہ ان سب کو اصل دین اور روحِ اسلام سمجھتا ہے، اور ان سب کی برابر تاکید کرتا ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے:

"وَابْتَغِ فِيْ مَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ". (القصص:۷۷)

"اور اللہ نے تمھیں جو کچھ دیا ہے، اس میں رہتے ہوئے تم آخرت کے طالب بنو، اور دنیا میں اپنے حصے کی ذمہ داری فراموش نہ کرو اور بھلائی کرو جس طرح اللہ نے تمھارے ساتھ بھلائی کی ہے"۔

تم نماز میں عقیدہ و عبادت کے سلسلے میں یہ ارشادِ الٰہی بھی پڑھتے ہو:

"وَمَآ اُمِرُوْآ اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ". (البينة:٥)

"حالاں کہ انھیں اسی کا تو حکم ہوا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اس کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے اور بالکل یکسو ہو کر۔ اور نماز قائم کریں اور زکاۃ دیں اور یہی راست ملت کا دین ہے"۔

فصل وقضا اور سیاست کے باب میں یہ فرمانِ الٰہی بھی پڑھتے ہو:

"فَلَاوَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَبَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّاقَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْماً". (النساء:٦٥)

"پس نہیں، تمھارے رب کی قسم، یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے، جب تک اپنے درمیان اٹھنے والے جھگڑوں میں تمھیں حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کر دو اس پر اپنے دِلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں اور بالکل اپنے آپ کو حوالے کر دیں"۔

تجارت اور دین کے سلسلے میں یہ احکام بھی پڑھتے ہو:

يٰـاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ، وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ، وَلَايَأْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ، وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَايَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئاً، فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهاً اَوْضَعِيْفاً اَوْلَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ، وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ، فَاِنْ لَمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى، وَلَايَأْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا، وَلَاتَسْئَمُوْآ اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْراً اَوْكَبِيْراً اِلٰى اَجَلِهٖ، ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَاللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰى اَلَّا تَرْتَابُوْا، اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ، فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا، وَاَشْهِدُوْا اِذَا تَبَايَعْتُمْ، وَلَايُضَآرَّ كَاتِبٌ وَلَاشَهِيْدٌ". (البقرة:٢٨٢)

"اے ایمان والو! جب تم کسی معین مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لو

کرو، اوراس کو لکھے تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ اور جسے لکھنا آتا ہو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے، بلکہ جس طرح اللہ نے اسے سکھایا، اسی طرح وہ دوسروں کے لیے لکھنے کے کام آئے اور یہ دستاویز لکھوائے وہ جس پر حق عائد ہوتا ہے، اور وہ اللہ سے جو اس کا رب ہے، ڈرے، اور اس میں کوئی کمی نہ کرے اور اگر وہ جس پر حق عائد ہوتا ہے، ناسمجھ یا ضعیف ہو، یا لکھوا نہ سکتا ہو تو جو اس کا ولی ہو، وہ انصاف کے ساتھ لکھوادے اور اس پر اپنے لوگوں میں سے دو مردوں کو گواہ ٹھہرالو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں، اس لیے کہ ایک بھول جائے گی تو دوسری یاد دلا دے گی، اور گواہ جب بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں اور قرض چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی مدت تک کے لیے اس کو لکھنے میں تساہل نہ برتو۔ یہ ہدایات اللہ کے نزدیک زیادہ قرینِ عدل، گواہی کو زیادہ ٹھیک رکھنے والی اور اس امر کے زیادہ قرینِ قیاس ہیں کہ تم شبہات میں نہ پڑو۔ ہاں اگر معاملہ دست بدست لین دین اور دست گرداں نوعیت کا ہو، تب اس کے نہ لکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور تم کوئی معاملہ خرید وفروخت کا کرو تو اس صورت میں گواہ بنالیا کرو، اور کاتب یا گواہ کو کسی طرح کا کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے“۔

اسی طرح جنگ وجہاد اور قتال کے باب میں یہ فرمان الٰہی پڑھتے ہو:

”وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلوٰةَ، فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ، فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَّرَآئِكُمْ، وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ، وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَّاحِدَةً، وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذىً مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضىٰ أَن تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ“. (النساء:۱۰۲)

”اور جب تم ان کے درمیان موجود ہو اور نماز میں امامت کر رہے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو، اور وہ اپنے ہتھیار لیے ہوئے ہو۔ پس جب وہ لوگ سجدہ کر چکیں، تو وہ تمھارے پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ آگے آئے، جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے، اور وہ تمھارے ساتھ نماز پڑھے، اور یہ بھی اپنی حفاظت کا سامان اور اپنے

اسلحے لیے ہوئے ہوں۔ کافر یہ تمنا رکھتے ہیں کہ تم اپنے اسلحے اور اپنے سامان سے ذرا غافل ہوتو وہ تم پر یک بارگی ٹوٹ پڑیں۔ اور اس بات میں تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اگر تمھیں بارش کے سبب سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو اپنے اسلحے اتار دو۔ البتہ اپنی حفاظت کا سامان لیے رہو"۔

ان کے علاوہ بے شمار آیتیں ہیں جو اجتماعی آداب اور معاشرتی امور کے سلسلے میں ہدایات دیتی ہیں۔

چوں کہ اخوان ہمیشہ کتاب الٰہی سے ہی وابستہ رہے، اسی سے راہ یاب وفیض یاب ہوئے، اس لیے انھیں یقین ہے کہ اسی وسیع اور جامع تصورِ دین کا نام اسلام ہے، اور ناگزیر ہے کہ وہ زندگی کے تمام امور پر حاوی رہے۔ سارے امور میں اسی کا جلوہ ہو ـــــ سب پر اسی کی فرماں روائی ہو، سب اسی کے اصول وتعلیمات کے تابع ہوں، سب اسی سے غذا حاصل کریں، اگر امت یہ چاہتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں اسلام پر رہے تو اس کے بغیر چارہ نہیں، لیکن اگر وہ عبادات میں تو اسلام پر رہی اور بقیہ معاملات میں غیر اسلام پر، تو ظاہر ہے کہ اس کا یہ اسلام سرتاسر ناقص ہے، اور وہ اس فرمانِ الٰہی کی مصداق ہے:

"اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ، فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْىٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ، وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ". (البقرہ:۸٦)

"کیا تم کتابِ الٰہی کے ایک حصے پر تو ایمان رکھتے ہو، اور ایک حصے کا انکار کرتے ہو جو لوگ تم میں سے ایسا کرتے ہیں ان کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں، اور آخرت میں یہ شدید ترین عذاب کی طرف بھیجے جائیں گے۔ اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو"۔

۲۔ ہمارا یہ عقیدہ بھی ہے کہ اسلام کی اساس اور دین کا سرچشمہ اللہ کی کتاب اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، جن کو اگر امت مضبوط تھامے رہی تو وہ کبھی گم راہ نہیں ہو سکتی۔ بہت سے افکار وعلوم جو اسلام سے وابستہ ہو گئے ہیں، اور اسی کے رنگ میں رنگے ہوئے

ہیں، ان افکار و علوم پر اپنے اپنے ادوار کی بھی چھاپ ہے، اور ان اقوام سے بھی وہ متاثر ہیں جن کے زمانے کی وہ پیداوار ہیں۔ لہٰذا ناگزیر ہے کہ وہ اسلامی نظام جن پر امت کو لے چلنا ہے، وہ اسی صاف وشفاف چشمے سے ماخوذ ہوں، ہم اسلام کو اسی طرح سمجھیں جس طرح ہمارے صالح اسلاف سمجھتے تھے، ہم ان ہی ربانی خطوط اور نبوی حدود پر ٹھہر جائیں، خود کو ان چیزوں کا پابند نہ کریں جن کا پابند خدا نے نہیں کیا ہے، نہ اپنے زمانے پر کوئی ایسا رنگ چڑھائیں جو اس کے لیے ناموزوں ہو، کہ اسلام تو ساری انسانیت کا دین ہے۔

۳۔ ہمارا یہ عقیدہ بھی ہے کہ اسلام چوں کہ ایک نہایت جامع، کامل اور ہمہ گیر دین، ہے جو زندگی کے تمام معاملات کو منظم کرتا، تمام امتوں اور ساری قوموں کو پیش نظر رکھتا اور تمام ادوار اور مراحل کا ساتھ دیتا ہے، لہٰذا وہ اس زندگی کی جزئیات سے بحث نہیں کرتا، چہ جائے کہ خالص دنیوی امور سے کہ یہ چیزیں اس کا موضوع بن ہی نہیں سکتیں! وہ تو صرف بنیادی اصول یا کلی ضابطے دیتا ہے۔ پھر عملی راہ سجھا دیتا ہے کہ معاملات کو ان اصولوں پر منطبق کیا جا سکے، اور ان کی روشنی میں قطعیت کے ساتھ صحیح فیصلہ کیا جا سکے یا کم از کم ظنِ غالب ہو سکے۔

اسلام نے اصلاحِ نفس پر پوری توجہ دی ہے کہ یہی نظاموں کا سرچشمہ اور تصورات ونظریات کی اصل ہے، چناں چہ اس نے ایسی کارگردوائیں تجویز کی ہیں جو اسے ہوا و نفسانیت سے پاک کرتی، خودغرضی و مفاد پرستی سے نجات دیتی، زیادتی، کوتاہی اور سرکشی سے باز رکھتی اور بلندی و کمال کی طرف اس کی رہ نمائی کرتی ہیں، اور نفس جب راہ پر آجائے، اور اس کے اندر پاکیزگی وستھرائی پیدا ہو جائے تو جو چیز بھی اس سے صادر ہوگی دلآویز و دل نواز اور خوش نما و پُر جلال ہوگی۔

کہا جاتا ہے کہ عدل، قانون کی عبارت میں نہیں، جج کی طبیعت میں ہوتا ہے۔ ایک قانون جو عدل وانصاف پر مبنی اور ہر جہت سے کامل و مکمل ہوتا ہے، وہ جب کسی ایسے جج کے ہاتھ میں آتا ہے جو خودغرض اور مفاد پرست ہوتا ہے، تو اسی قانون سے عدل وانصاف کی چاندی جھٹکنے کے بجائے ظلم وجور کے شرارے پھوٹتے ہیں، اس کے برعکس نہایت ناقص اور ظالمانہ

قانون کسی ایسے جج کے ہاتھ میں آتا ہے جو بلند طبیعت، انصاف پسند اور بے لوث ہوتا ہے تو اسی قانون کی شاخ خبیث سے خیر و برکت اور انصاف و رحمت کے گل کھلنے لگتے ہیں۔

اسی لیے اللہ کی کتاب میں تزکیۂ نفس کا بڑا اہتمام ہے، چناں چہ وہ روحیں جو اسلام کے سانچے میں ڈھل گئی تھیں، انسانی کمال کا نمونہ تھیں، ان ہی وجوہ سے اسلام کا مزاج تمام زمانوں اور ساری قوموں کے لیے سازگار ہے، اور وہ ہر ایک کی ضروریات کا کفیل ہے۔اس کے علاوہ اسلام کبھی کسی صالح نظام کی خوشہ چینی سے گریز نہیں کرتا، بشرطیکہ وہ اس کے عام اصولوں اور کلی ضابطوں سے متصادم نہ ہو۔

معزز دوستو! میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ یہ تو بہت وسیع موضوع ہے، اخوان کے ذہنوں میں فکرِ اسلامی کا جو وسیع اور جامع تصور ہے اس کی وضاحت کے لیے تو اتنی باتیں کافی ہیں۔

اخوان المسلمون کا فکر تمام اصلاحی پہلوؤں کا جامع ہے

اخوان کے اس وسیع، جامع اور ہمہ گیر تصورِ اسلام کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت کے اندر اصلاح کے جتنے بھی پہلو ہیں ان سب پر ان کا فکر حاوی ہو گیا، تمام اصلاحی مکاتبِ فکر کے بہتر عناصر کو اس نے اپنے اندر سمو لیا، اور ہر مخلص و غیور مصلح کو اس میں اپنی آرزوؤں کے عکس اور تمناؤں کی تصویریں نظر آنے لگیں، جن صلاح پسند روحوں نے اسے پہچان لیا اور اس کے مقاصد اور رازمانوں کو سمجھ لیا، ان کی امیدوں کا وہ مرکز بن گیا، چناں چہ تم چاہو تو بے تکلف کہہ سکتے ہو کہ تحریکِ اخوان:

۱۔ایک ''سلفی دعوت'' ہے، کیوں کہ وہ اسلام کو اس کے خالص سرچشمے، کتاب و سنت کی طرف لوٹانے کی داعی ہے۔

۲۔کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک ''سنی مسلک'' ہے، کیوں کہ وہ تمام چیزوں میں بالخصوص عقائد و عبادات میں سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر گامزن ہے۔

۳۔کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ ''تصوف کا ایک حلقہ'' ہے، کیوں کہ وہ خیر کی

اساس، دل کی طہارت، نفس کی پاکیزگی، عمل پر مداومت، مخلوق سے درگزر، اللہ کے لیے محبت اور نیکی کے لیے یگانگت کو سمجھتی ہے۔

۴۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک ''سیاسی تنظیم'' ہے کیوں کہ اس کا مطالبہ ہے کہ حکومت کی اصلاح کی جائے، اس کی خارجہ پالیسی میں ترمیم کی جائے، رعایا کے اندر عزت وخودداری کی روح پھونکی جائے اور آخری حد تک ان کی قومیت کی حفاظت کی جائے۔

۵۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک ''ورزشی ٹیم'' ہے۔ کیوں کہ وہ صحت وتندرستی کا خیال رکھتی ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ طاقت ور مومن کمزور مومن سے بہتر ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''ان لبدنك عليك حقاً'' تمھارے بدن کا بھی تم پر حق ہے۔

نیز اسلام کے تمام فرائض صحیح صحیح ادا نہیں ہو سکتے جب تک مضبوط وتوانا جسم نہ ہو، نماز، روزہ، زکاۃ، حج کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا جسم ہو رزق کی تلاش میں، جدوجہد کرنے اور معاشی مشقتیں برداشت کرنے کی تاب رکھتا ہو، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی ورزشی ٹیموں اور ریاضتی تنظیموں کے لیے اتنا اہتمام کرتے ہیں کہ بسا اوقات وہ ٹیمیں بھی نہیں کر پاتیں جو خاص اسی کام کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔

۶۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ ''ایک علمی اور ثقافتی ادارہ'' ہے۔ یہ اخوانی انجمنیں حقیقت میں علم وثقافت کی درس گاہیں اور جسم وروح کی تربیت گاہیں ہیں، کیوں کہ اسلام کے نزدیک حصول علم ہر مسلم مرد، عورت پر فرض ہے۔

۷۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک ''معاشی کمپنی'' ہے، کیوں کہ اسلام صحیح رُخ سے مال کمانے کی بھی ترغیب دیتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''نعم المال الصالح للرجل الصالح''.

''اچھے آدمی کے پاس اچھا مال کیا خوب ہے''۔

اسی طرح فرمایا:

''من امسیٰ كالّاً من عمل يده امسیٰ مغفوراً له''.

''جو کام کرتے کرتے شام تک تھک کر چور ہو گیا تو اس نے شام کی اس حال میں کہ اس کی مغفرت ہو گئی''۔

''ان اللّٰہ یحب المؤمن المحترف''.

''ہنرمند اور پیشہ ور مومن کو اللہ دوست رکھتا ہے''۔

۸۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک ''سماجی تنظیم'' ہے، کیوں کہ وہ معاشرۂ اسلامی کی بیماریوں پر دھیان دیتی، ان کا علاج دریافت کرتی اور امت کو صحت مند رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔

اس طرح تصورِ اسلام کی جامعیت نے ہمارے فکر کو تمام اصلاحی پہلوؤں کا جامع بنا دیا، یہ تمام گوشے اخوانی سرگرمیوں کے دائرے میں آ گئے، جب کہ دوسرے لوگ کسی ایک طرف ہی جھکے ہوتے ہیں، ہمارا کارکن بیک وقت ان تمام پہلوؤں کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ اسلام تو ان تمام پہلوؤں کا ہی مطالبہ کرتا ہے۔

اسی لیے لوگوں کو اخوان کے ہاں تضاد نظر آتا ہے، حالاں کہ فی الواقع کوئی تضاد نہیں ہوتا، لوگ دیکھتے ہیں کہ ہمارا مسلم بھائی محراب کے اندر خشوع و خضوع اور عجز و نیاز کی تصویر بنا گریہ وزاری میں مصروف ہے، پھر وہی بھائی وعظ و تذکیر سے دلوں کو گرما رہا ہے، پھر وہی ایک ماہر کھلاڑی کی طرح گیند کی شاٹ لگا رہا ہے، دوڑ کی مشق کر رہا ہے، تیراکی میں مہارت پیدا کر رہا ہے، اور پھر وہی تجارت گاہ یا کارخانے میں دیانت داری و اخلاص کے ساتھ اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا ہے۔ یہ تمام کام لوگوں کو مختلف اور بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں، لیکن اگر یہ ذہن میں رہے کہ اسلام ان تمام ہی چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے، وہ ان سب کی تاکید کرتا ہے، تو پھر انھیں ان کے اندر کوئی تضاد نہ نظر آئے!

البتہ ان سرگرمیوں کے اندر جو کمزور پہلو ہیں، یا جو لوگوں کے اعتراض اور چہ می گوئیوں کے موجب بن سکتے ہیں ان سے اخوان مکمل احتراز کرتے ہیں۔

وہ ناموں کی عصبیت سے بھی دور بھاگتے ہیں، کیوں کہ اسلام کے رشتۂ جامع نے انھیں ایک ہی لقب - اخوان المسلمون - کے گرد جمع کر دیا ہے۔

ضمیمہ-۲

تحریک اخوان المسلمون

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق

مولانا نذرالحفیظ ندوی ازہری

نئی نسل اس جماعت کے بانی کی جینیس شخصیت، جدید تعلیم یافتہ نسل پر ان کے غیر معمولی اثرات اور کارناموں سے پوری طرح واقف نہیں، ان کی معلومات کا دائرہ موجودہ میڈیا اور مغربی خبر رساں ایجنسیوں کی فراہم کردہ ناقص خبروں تک محدود ہے، اسی طرح ۱۹۵۲ء سے لے کر ۲۰۱۱ء تک مسلسل ہنگامی حالات اور فوجی استبداد کے بعد جمہوری طرز پر منعقد انتخابات کے نتیجے میں ایک جمہوری حکومت کے قیام، پھر صرف ایک سال کے اندر حسنی مبارک کے دور کے وزراء و حکام، تجار و قضاۃ، شہری زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی فوج اور پولیس نیز لبرل اور ملحد و بے دین عناصر نے کس طرح غنڈہ گردی، رہزنی اور سی آئی اے اور موساد کے ایجنٹوں کے تعاون سے مصری فوج کے سربراہ سیسی نے حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور جمہوری طور پر صاف شفاف انتخابات کے ذریعے قائم حکومت کے صدر محمد مرسی کو قید و بند میں ڈال دیا، پھر جب پر امن مظاہرین نے لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو کر صدر مرسی کی بحالی کا مطالبہ کیا تو انتہائی سفا کی اور درندگی کا معاملہ کرتے ہوئے چھ ہزار سے زائد بے گناہ مردوں، خواتین حتی کہ معصوم بچوں کو بھی قتل کر دیا گیا، پچاس ہزار سے زائد

زخمی ہو گئے، بلڈوزروں سے انکو کچلا گیا، مسجدوں کو جلایا گیا، ان سے متصل ہسپتال، اس میں موجود دواؤں کے اسٹور حتیٰ کہ مریضوں کو جلانے کی پوری کوشش کی گئی، برطانوی وامریکی میڈیا کا کہنا ہے کہ اس طرح کے ہولناک واقعات ان نامہ نگاروں نے بھی اپنی زندگی میں نہیں دیکھے جو جنگی واقعات کی نامہ نگاری کرتے ہیں، لیکن ہندوستانی میڈیا حتیٰ کہ اردو میڈیا مصری حکومت کے جھوٹے بیانات ہی کو جگہ دیتا رہا، یہ تاثر بھی مسلسل دیا جاتا رہا کہ مظاہرین اسلحے سے لیس ہیں اور امریکہ کی پشت پناہی میں ایسا کیا جارہا ہے۔

ہم یہاں انتہائی اختصار سے ''اخوان المسلمین'' کے بانی حسن البناء اوران کی طاقتور تحریک کے عالم عربی پر غیر معمولی اثرات کا جائزہ پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہماری نئی نسل اس سے واقف ہو سکے جو حضرات تفصیل سے اخوان کے حالات معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ مصری مصنف شوقی ذکی کی مرتب کردہ کتاب ''اخوان المسلمین'' کا مطالعہ کریں جس کا ترجمہ ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی نے اردو میں کیا ہے، انھیں کے قلم سے ایک فاضلانہ پراز معلومات مقدمہ بھی ہے، جوان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات اور اخوانی قیادت کے اہم ارکان سے ذاتی تعلقات پر مبنی ہے۔

حسن البنا ایک دیندار، علمی گھرانے میں ۱۹۰۶ء میں اسماعیلیہ شہر کے قریبی علاقہ محمودیہ میں پیدا ہوئے، ان کے والد احمد عبدالرحمٰن ممتاز عالم، محدث اور متعدد احادیث کے مجموعوں کے محقق تھے، سن بلوغت سے پہلے ہی سے حسن البنا کو عبادت کا بڑا شوق تھا، وہ رجب، شعبان اور رمضان کے روزے پابندی سے رکھتے تھے، بچپن ہی سے دعوتی اور اصلاحی کاموں سے دلچسپی لیتے تھے، دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کے تمام مراحل امتیازی نمبروں سے پاس کر کے مختلف مقامات پر تدریس کے ساتھ دعوت کا کام بھی کرتے تھے، ۱۹۲۸ء میں حسن البناء نے تحریک اخوان کی بنیاد ڈالی، بہت جلد یہ تحریک پورے ملک میں پھیل گئی، اس لیے کہ اس نے مصریوں کی اخلاقی زندگی پر بڑا اثر ڈالا، حسن البنا نے صنعت وتنظیم کی طرف توجہ کی اور اپنے رفقاء کے تعاون سے صنعت وتجارت کے میدان میں قدم رکھا، ۱۹۳۹ء

میں اخوان نے چار ہزار مصری پونڈ کے سرمایہ سے ایک اسلامی کمپنی قائم کی، جس میں اخوانیوں نے حصہ لیا، اس کی مقبولیت کو دیکھ کر اس کا سرمایہ بیس ہزار پونڈ کر دیا گیا، اس کمپنی نے ٹرانسپورٹ کی سروس قائم کی، پیتل کی ایک بہت بڑی فیکٹری قائم کی جو گیس چولھے اور اس کے پرزے بناتی تھی، اس کمپنی کی مصنوعات نے نہ صرف ملک کے اندر بلکہ تمام عرب ممالک میں مقبولیت حاصل کر لی، دوسری کمپنی ۱۹۴۷ء میں عربی کان کنی کمپنی کے نام سے سات ہزار پونڈ کے سرمایہ سے قائم کی گئی، بعد میں دونوں کمپنیوں کو ایک دوسرے میں ضم کر کے دس فیکٹریاں قائم کی گئیں، یہ فیکٹریاں سیمنٹ، پتھر، سنگ مرمر کے تراشنے کی مشینیں تیار کرتی تھیں، ۱۹۴۸ء میں اخوان نے ٹکسٹائل ملز قائم کیے جس کی مصنوعات نے نہ صرف مصر بلکہ عالم عربی میں برطانوی اور فرانسیسی کپڑا صنعت کو زبردست نقصان پہونچایا، برطانوی سفیر نے اس کمپنی کے خلاف مصری حکومت میں شکایت کر دی، برطانوی کپڑا صنعت کو غیر معمولی نقصان کی وجہ سے حکومت پر دباؤ ڈال کر کارخانے کو بند کر دیا گیا۔

اخوانیوں نے میڈیا کے میدانوں میں بھی قدم رکھا، چنانچہ ایک بڑا پریس قائم کر کے متعدد رسالے، اخبارات نکالے گئے، ان میں ایک روزنامہ، دو ہفت روزہ، ایک ماہنامہ نکالے گئے، ان رسائل و اخبارات کے علاوہ ''مجلة الدعوة''، منبر الشرق'' اور ''المسلمون'' بھی شائع ہو کر ذہن سازی میں اپنا کردار ادا کرتے رہے، شعبۂ تصنیف کے ذریعے بچوں، نوجوانوں اور خواتین کے لیے کتابیں تیار کر کے شائع کی جاتی تھیں، حسن البنا کی شہادت تک مختلف علمی، ادبی، تحقیقی، اور دعوتی و تربیتی موضوع پر دو سو کتابیں تیار کی گئیں۔

اخوان نے دینی و اخلاقی تربیت کی طرف بھی توجہ کی، عقیدہ کی اصلاح، اخلاق و معاملات کی درستگی، نماز، روزے، حج، زکوۃ کی ادائیگی کا غیر معمولی اہتمام کیا جاتا تھا، عام طور پر اخوان سے تعلق رکھنے والے ورع و تقویٰ، زہد و قناعت، اور ایثار و قربانی کی روح کے حامل تھے، ان کی اس پختہ تربیت اور دین سے مخلصانہ تعلق کا اثر تھا کہ ناصر کے دور میں غیر معمولی مظالم کے باوجود وہ ثابت قدم رہے، اخوان سے تعلق رکھنے والے داعیوں

اوراس کے ممتاز علماء کوتختہ دار پر لٹکایا گیا مگران کے پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش نہیں ہوئی، پھران پر انعامات کی بارش ہونے لگی، اعلیٰ مناصب پیش کیے گئے مگر وہ ثابت قدم رہے، یہ ہولناک سلسلہ (مظالم) ۱۹۴۹ء سے اب تک جاری ہے، اور نہیں معلوم کہ اس کی انتہا کب ہوگی اور ''متی نصر اللہ'' کا مژدۂ جانفزا کب ملے گا، حسن البناء کی شہادت کے بعد سے اخوان کی یہ تیسری نسل ہے، جو اپنے مرشد کے ساتھ کیے ہوئے عہد پر قائم ہے۔

''رجال صدقوا ماعاهدوا الله عليه، فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر وما بدلوا تبديلاً''۔

مردوں کی طرح اخوان نے خواتین کے لیے بھی نظام تعلیم وتربیت کی طرف توجہ کی، تعلیم بالغان، سوسائٹی میں سماجی اور رفاہی کاموں کی طرف توجہ، بے گھر لوگوں کو مکان مہیا کرنا، طبی مقاصد کے لیے ہسپتال اور ان میں مریضوں کو مفت دوا اور علاج کی سہولتیں فراہم کرنا، عصری و دینی تعلیم حاصل کرنیوالے طلبہ کی نصرت، بیواؤں اور یتیموں کی خبر گیری کے مراکز، ڈاکٹروں اور انجینئروں کی خدمات سے معاشرہ کو فائدہ پہونچانا، عرب ملکوں کے عوام وخواص سے خصوصی تعلق قائم کرنا، غیر مسلموں خصوصاً مصر میں موجود قبطی عیسائیوں سے روابط اور دینی دعوت کو ان تک پہونچانا، عیدین اور قومی مناسبات کے مواقع پر ان سے اجتماعی ملاقات، سرکاری محکموں میں کام کرنے والے افسروں سے روابط، ان کو دینی و تربیتی کاموں میں مدعو کرنا، دیہاتوں میں کسانوں کے حالات سے واقفیت، زراعت میں ان کی مدد، سبزی اور پھلوں کی پیداوار کے لیے انہیں مشورے دینا، غرض کہ زندگی کے مسائل ومشکلات کا سامنا اور انہیں حل کرنا، اور حرفت وصنعت کے میدان میں ضرورت مندوں کی مالی مدد، یہ وہ کام تھے جن سے اخوان نے سخت ترین آزمائشی دور میں بھی غفلت نہیں برتی، اس بنا پر اخوان کی جڑیں مصری معاشرے میں بہت گہری اور مضبوط و مستحکم ہیں۔ جہاد فلسطین میں مصر وشام کے اخوانی مجاہدین نے جس طرح سرفروشی کی وہ ناقابل فراموش اور اخوانیوں کی ایمانی قوت کا ایک روشن اور تابناک باب ہے، عرب لیگ اور عرب حکمرانوں نے بے غیرتی کا

جوثبوت دیا وہ ایک سیاہ صفحہ ہے جو مستقل بحث کا طالب ہے، مصر کے علاوہ شام، عراق، الجزائر، لیبیا اور سوڈان میں اخوان سے متاثر ہو کر جو تحریکیں چلائی گئیں وہ الگ داستان ہے۔

حسن البنا کی شہادت کے بعد جو قیادت سامنے آئی، ان میں سابق چیف جسٹس حسن الہضیبی ہیں جنہوں نے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۳ء تک زیرزمین جماعت کی قیادت کی، ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۰ء تک استاذ عمر التلمسانی نے جیل سے رہائی کے بعد اخوان کی قیادت کی، ان ہی کے دور میں اخوان نے محدود پیمانے پر سرگرمی شروع کی، اس لیے کہ انور السادات کے دور میں اخوانیوں کو پوری آزادی حاصل نہیں تھی، پھر بھی انہوں نے ایک سو چار کمپنیاں اور کارخانے قائم کیے جو اپنے حصہ داروں کو تیس سے چالیس فیصدی منافع دیا کرتی تھیں مگر حسنی مبارک کے دور میں یہ تمام کمپنیاں یہودی سرمایہ داروں کے ہاتھ اونے پونے فروخت کردی گئیں، تلمسانی کی وفات کے بعد استاذ حامد ابونصر نے ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۶ء تک اخوان کی قیادت سنبھالی، ان کے نائب مصطفیٰ مشہور رہے جو بعد میں مرشد عام بنائے گئے، مصطفیٰ مشہور نے قاہرہ یونیورسٹی سے مائیکرولوجی میں گریجویشن کیا تھا، حسن البناء کو چھوڑ کر باقی قائدین نے اخوان کے زیرسایہ دینی علوم میں مہارت کے ساتھ اعلیٰ اخلاقی تربیت حاصل کی، اس راقم نے قاہرہ کے زمانۂ قیام میں استاذ التلمسانی، مصطفیٰ مشہور اور صالح عشماوی سے ''الدعوۃ'' کے دفتر میں متعدد بار ملاقات کا شرف حاصل کیا، ان میں سے عمر تلمسانی نے بیس سال اور مصطفیٰ مشہور نے مجموعی طور پر انیس سال قید و بند میں گذارے، یہ ساری مدت مسلسل عذاب میں گذری، ہماری درخواست اور بڑے اصرار پر اپنے ہاتھ اور پشت کھول کر دکھائے جو شدید ضرب کی وجہ سے سیاہ پڑ گئے تھے، بعض مقامات گوشت کو نوچنے کی وجہ سے سفید ہو گئے تھے، سوال کیے جانے پر ''الحمدللہ'' کہا اور اس آزمائش پر اللہ تعالیٰ کا دل کی گہرائیوں سے اس طرح شکر ادا کرتے تھے جیسے کوئی لذیذ غذا کھا کر شکریہ ادا کرتا ہے۔

حامد ابوالنصر کے دور میں اخوان نے مصری معاشرے میں دوبارہ اپنے وجود کو پوری طرح تسلیم کرانے کی کامیاب کوشش کی، مختلف پیشہ ورانہ تنظیموں، یونیورسٹی کے

تدریسی عملے اور قومی اداروں میں وہ پہلے کی طرح داخل ہوئے، چنانچہ اپریل ۱۹۸۷ء میں اخوانیوں نے دونئی سیاسی پارٹیوں "حزب العمل" اور "حزب الاحرار" کے ساتھ معاہدہ کر کے مصری پارلیمنٹ کے انتخابات میں ۳۶ نشستیں پہلی بار حاصل کرلیں، اس کے نتیجے میں پارلیمنٹ میں اپوزیشن کی قیادت اخوان کو حاصل ہوگئی۔

۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں حکمراں پارٹی کے ہنگامی قوانین کے تسلسل، منصفانہ اور آزادانہ انتخابات کی گارنٹی نہ ہونے کے موضوع پر مخالف پارٹیوں کے تعاون سے اخوان نے الیکشن کا بائیکاٹ کیا، لیکن لوکل باڈیز کے انتخابات میں انہیں خاصی کامیابی ملی، ۱۹۹۳ء میں حسنی مبارک کے تیسری بار صدارتی منصب کے لیے کھڑے ہونے کی اخوان نے مخالفت کی تو وہ پھر حکومت کے انتقام کا نشانہ بنے، نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف الزامات میں اخوان کی پوری قیادت کو جیلوں میں ڈال دیا گیا، ۲۰۱۱ء میں خود مبارک کے لوگوں نے مخالفت کی زبردست مہم چلائی، اس میں ان کے ذاتی مفادات تھے، عوامی مخالفت بھی ظاہر ہونے لگی، اخوان نے محتاط رویہ اختیار کیا، آخر میں ان پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ بھی شریک ہوں، اس موقع پر حمدین صباحی، اور شفیق وبرادعی لبرل رجحانات اور استبداد سے چھٹکارا پانے کے نعرے کے ساتھ، اور اخوان دینی ودعوتی عزائم کے ساتھ سامنے آئے، یہی مقاصد آخر تک ان کے پیش نظر رہے، یہاں تک کہ صاف شفاف اور آزادانہ انتخابات نے اپنا فیصلہ سنا دیا، محمد مرسی نے مصر کو خاص طور سے اور عالم اسلام کو عام طور سے مغربی استعمار سے آزادی دلانے کی بھرپور کوشش کی مگر ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟

دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

لیکن اس سب کے باوجود اخوان کا مزاج جس خمیر سے تیار ہوا ہے وہ اقبال کے الفاظ میں ع

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا

ضمیمہ-۳

امام حسن البنا پر ایک نظر

نام:- حسن بن احمد عبدالرحمٰن البنا۔

پیدایش:- مصر کے ایک علاقے ''البحیر ۃ'' کے محمودیہ نامی گاؤں میں ۲۵ ؍شعبان ۱۳۲۴ھ مطابق اکتوبر ۱۹۰۶ء بروز اتوار۔

والد محترم کا مختصر تعارف:- آپ کا نام عبدالرحمٰن البنا تھا، گھڑی سازی کی وجہ سے (الساعاتی) یعنی گھڑی ساز کے نام سے مشہور ہوئے، آپ کا شمار اعلیٰ درجے کے علماء حدیث میں ہوتا ہے، آپ کا سب سے بڑا کارنامہ مسند امام احمد کو فقہی ترتیب پر تخریج احادیث اور مختصر شرح کے ساتھ نئے انداز سے مرتب کرنا ہے جس کو انھوں نے "الفتح الربانی لترتیب مسندالامام احمدبن حنبل الشیبانی" کے نام سے شائع کیا۔ اسی طرح "بدائع المنن فی جمع و ترتیب مسندالشافعی و السنن" بھی ان کی ایک اہم کتاب ہے۔

والدہ ماجدہ:- ام سعد بنت ابراہیم صقر احمد اپنے شوہر ہی کے گاؤں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والد مویشی تاجر تھے۔

تعلیم:- آٹھ سال کی عمر میں ''مدرسۃ الرشاد الدینیہ'' میں داخل ہوئے اور وہاں چار سال تک تعلیم حاصل کی، یہی تعلیم ان کی شخصیت سازی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، ثانویہ کی تکمیل کے بعد ''مدرسۃ المعلمین الأولیۃ'' سے ۱۹۲۰ء میں فراغت حاصل کی۔

مزید تعلیم کے لیے دارالعلوم قاہرہ میں داخلہ لیا، اور ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۷ء میں امتیاز کے ساتھ وہاں سے فارغ ہوئے۔ شیخ محب الدین الخطیب سے ان کے خاص روابط تھے، ان کے علاوہ بیشتر علماء سے ان کی ملاقاتیں رہیں۔

۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں الاخوان المسلمون کی بنیاد ڈالی، اسی سال ''المنار'' کو ازسرنو جاری کیا، اوراستعماری طاقتوں سے مقابلے کے لیے سرگرم ہوئے۔ ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں سیاسی میدان میں قدم رکھا اور حکام وامراء کے نام خطوط لکھ کر ان سے اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کیا اور خلافت راشدہ کے طرز پر اسلامی حکومت کے قیام کی امید ظاہر کی، ان کا کہنا تھا اسلامی حکومت قائم نہ کرنے کی صورت میں تمام مسلمان مجرم وخطار کار ہوں گے۔

تالیفات:- ان کے قلم سے متعدد رسائل، ''احادیث الجمعہ'' اور ''الماثورات'' اور آپ بیتی بعنوان ''الدعوۃ والداعیۃ'' نکلے۔ ان کے والد ماجد نے اپنی کتاب الفتح الربانی کا مقدمہ لکھنے کی ذمہ داری ان کے سر ڈالی، اسی طرح مصنف کتاب امام احمدؒ کے حالات پر بھی ایک مضمون لکھوایا جس کو انھوں نے بحسن وخوبی انجام دیا۔

آپ کا شمار صف اول کے خطباء میں ہوتا ہے۔ آپ کی تقریروں میں جوش وانفعال کے بجائے سکون کی کیفیت نمایاں ہوتی لیکن سامعین بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے، اس سکون واطمینان کی تقریر کے ذریعے وہ حاضرین کے جذبات میں زبردست انقلاب برپا کردیتے تھے۔

مقاصد:- ان کے سامنے دو ہی مقصد تھے (۱) اسلامی ملک کو ہر طرح کی خارجی اثرات سے پاک کرانا۔ (۲) آزاد اسلامی ملک میں آزاد اسلامی حکومت کا قیام۔

آپ نے اپنے ماننے والوں کی تربیت ایمانیات پر کی۔ اس کے لیے دعوت دینا، اوراس کی خاطر ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار کرنا، دعوت کے سلسلے میں جو آزمائشیں پیش آئیں ان کا صبر وثبات سے مقابلہ کرنا، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت ووفاداری کا ثبوت دینا، اسلام کو مکمل نظام حیات تصور کرنا، اوراس کے نظام کے نفاذ کو لازمی اور ضروری قرار دینا۔ یہ ان کی تربیت کے نمایاں پہلو تھے، انھوں نے حقیقتاً ایک اسلامی انقلاب برپا کیا۔ اخلاقی گراوٹ اور مغربی افکار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

شہادت:- ابراہیم عبدالہادی کی حکومت نے انگریزوں کے اشارے پر حکومتی ہتھیار اور حکومت کے کارندوں کے ذریعے ۱۲ر فروری ۱۹۴۹ء مطابق یکم ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ کو قاہرہ میں انھیں شہید کردیا۔

ضمیمہ-۴

امام حسن البنا اور اخوان المسلمون سے متعلق چند اہم کتابیں

(الف) امام حسن البنا کی تالیفات، رسائل ومقالات جن سے ان کے افکار ومقاصد کو بہتر طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف
۱	مجموعة رسائل الامام حسن البنا	امام حسن البنا
۲	خطب حسن البنا	امام حسن البنا
۳	مقالات حسن البنا	امام حسن البنا
٤	مذكرات الدعوة والداعية	امام حسن البنا
	(ب) امام حسن البنا کی شخصیت، ان کی سیرت وافکار اور کارناموں سے متعلق کتابیں	
٥	حسن البنا مواقف في الدعوة والتربية	از عباس السيسى
٦	الملهم الموهوب حسن البنا	عمر التلمسانى
٧	قائد الدعوة	انور الجندى
٨	حسن البنا الرجل القرانى	روبرٹ جیکسن
٩	الامام حسن البنا مجدد القرن-رجل بأمة وأمة فى رجل	از ڈاکٹر توفیق الواعى
١٠	الامام الشهيد حسن البنا	ڈاکٹر جابر قميحه
١١	حسن البنا الرجل والفكر	محمدعبدالله السمان
١٢	حسن البنا رجل على موعد	ايمن حموده
١٣	التربية الاسلامية ومدرسة حسن البنا	يوسف القرضاوى
١٤	ظروف انشاه وشخصية الامام المؤسس	جمعة أمين
١٥	فى صحبة المرشد العام	عبدالفتاح المحروقى
١٦	لماذا اغتيل الامام حسن البنا	عبدالمتعال الجبرى

۱۷	من قتل حسن البنا	محسن محمد
(ج) اخوان المسلمون کی حقیقت اور اس کی تاریخ سے متعلق کتابیں		
۱۸	تاریخ الاخوان المسلمین (مصر)	مصطفی محمدالطحان
۱۹	الاخوان المسلمون	ریچرڈ مشیل
۲۰	الاخوان المسلمون أحداث صنعت التاریخ	عبدالحلیم محمود
۲۱	الاخوان المسلمون کبری الحرکات الاسلامیة	اسحاق موسی الحسینی
۲۲	الاخوان المسلمون والمجتمع المصری	محمدشوقی ذکی
۲۳	فی قافلة الاخوان المسلمین	عباس السیسی
۲٤	الاخوان المسلمون فی میزان الحق	محمدفرید عبدالخالق
۲۵	أوراق من تاریخ الاخوان المسلمین	جمعه أمین
۲٦	الاخوان المسلمون فی حرب فلسطین	کامل الشریف
۲۷	الاخوان المسلمون دعاة حق لاطلاب حکم	محمدسلامه جبر
۲۸	الاخوان المسلمون ۷۰ عاماً فی الدعوة والتربیةوالجهاد	یوسف القرضاوی
۲۹	الاخوان المسلمون بین عبدالناصر والسادات من المنشیة الی المنصة	از د.زکریا سلیمان بیومی
۳۰	التربیة السیاسیة عند جماعة الاخوان	عثمان عبدالمعز رسلان
۳۱	الاخوان المسلمون تحت قبة البرلمان	محسن راضی
۳۲	أریدأن أتحدث الی الاخوان	ابوالحسن علی الحسنی الندوی
۳۳	روح وریحان	احمدحسن حجاجی
۳٤	مجموعة خطبات	شیخ عبدالله العقیل
۳۵	حقیقة الخلاف بین الاخوان وعبدالناصر	محمدحامد ابوالنصر
۳٦	الاخوان المسلمون ٦۰ قضیة ساخنة	مامون الهضیبی
۳۷	الاخوان المسلمون مع دستور مکتوب	مامون الهضیبی
۳۸	تساؤلات علی الطریق	مصطفی مشهور
۳۹	عقبات فی الطریق	مصطفی مشهور

٤٠	جماعة الاخوان المسلمين في الأردن	ابراهيم غرايبة
٤١	الاخوان المسلمون	سعيد حوى
(د) اخوان کے راستے میں آئی رکاوٹوں، ان کے خلاف سازشوں اور ان کی آزمائشوں اور مصائب پر مشتمل کتابیں		
٤٢	أيام من حياتي	زينب الغزالي
٤٣	البوابة السوداء	احمدرائف
٤٤	الصامتون يتكلمون	كمال الدين حسين
٤٥	نافذة على الجحيم	
٤٦	الموتى يتكلمون	
٤٧	وراء الأسوار	جمال الدين الحمامصي
٤٨	الأيام الحاسمة وحصادها	حسن عشماوى
٤٩	شهداء وقتلة	عادل وعصام سليمان
٥٠	أقسمت أن أروى	روكسي معكرون
٥١	المذبحة	مصطفى المصيلحي
٥٢	مذبح الاخوان في سجون مصر	جابر رزق
٥٣	حصاد الأيام اومذكرات هارب	حسن عشماوى
٥٤	شهداء على الطريق	حسن دوح
٥٥	وثيقة خطيرة تفضح مخطط الناصرية	
٥٦	مؤامرة ضد الاسلام في مصر	
٥٧	المقاومة السرية في قناة السويس	كامل الشريف
٥٨	كفاح الشباب الجامعي على الفتاة	حسن دوح
٥٩	لماذا قتل سيدقطب واخوانه الابرار	
٦٠	حقائق عن الحكم والمحاكمات في مصر	
٦١	لعبة الأمم	مايلز كوپلانڈ
٦٢	صفحات من جهاد الشباب المسلم	حسن دوح
٦٣	الاخوان والتورد	حسن العشماوى

(ہ) اخوان کے بعض رہنماؤں کے سوانح، اہم شخصیات کی خودنوشت اور ڈائریاں اور مصر کی اس وقت کی تاریخ سے متعلق دیگر کتابیں جن میں اخوان سے متعلق وقیع معلومات ہیں		
٦٤	صفحات من التاريخ (حصاد العمر)	صلاح شادى
٦٥	مذكرات عبداللطيف البغدادى	عبداللطيف البغدادى
٦٦	ذكريات لا مذكرات	عمرالتلمسانى
٦٧	البحث عن الذات	انورالسادات
٦٨	مذكراتي في السياسة المصرية	محمدحسين هيكل
٦٩	الاخوان....وأنا	جنرل فواد علام
٧٠	حسن الهضيبى حياته وآثاره	عبدالحليم الكنانى
٧١	حسن الهضيبى المرشد الثاني للاخوان	نبيه عبدربه
٧٢	المرشد العام الثاني معلم الصمت الشامخ	عمرالتلمسانى
٧٣	عمرالتلمسانى شاهداً على العصر	ابراهيم قاعود
٧٤	عمرالتلمسانى	محمدسعيدعبدالرحيم
٧٥	عمرالتلمسانى وداعاً	
٧٦	دعاة لا قضاة	حسن الهضيبى
٧٧	الحركات السياسية فى مصر	طارق البشرى
٧٨	فى أعقاب الثورة المصرية	عبدالرحمن الرافعى
٧٩	تقويم الفكر الحركي للتيارات الاسلامية	ڈاكٹرعبدالله النفيسى
٨٠	الاحزاب والحركات والجماعات الاسلامية	المركز العربى للدراسات
٨١	مع الحركات الاسلاية فى الدول العربية	ڈاكٹرعبدالله أبوعزة
٨٢	الملامح العامة للفكر السياسى الاسلامى	طارق البشرى
٨٣	الغارة على العالم الاسلامى	استاذ شاتيله
٨٤	الحركات الاسلامية فى مصر	ڈاكٹررفعت سيداحمد
٨٥	وثائق فى تاريخ مصر المعاصر	
٨٦	عند مايحكم الطغاة	
٨٧	التقرير الاستراتيجى العربى ١٩٩٠	موسسة الاهرام

۸۸	تحدید الفکر الاسلامی	ڈاکٹر حسن الترابی
(و) اردو میں امام حسن البنا اور اخوان المسلمون سے متعلق چند اہم کتابیں ان میں سے کچھ کتابیں مذکورہ بعض کتابوں کے ترجموں پر مشتمل ہیں۔		
۸۹	اخوان المسلمون: تاریخ دعوت خدمات	از خلیل حامدی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی
۹۰	حسن البنا شہید کی ڈائری (ترجمہ مذکرات الدعوۃ والداعیۃ)	از خلیل حامدی //
۹۱	مجاہد کی اذان (ترجمہ رسائل حسن البنا)	از محمد عنایت اللہ اسد سبحانی //
۹۲	زنداں کے شب و روز (ترجمہ ایام من حیاتی)	از خلیل حامدی //
۹۳	رودادِ ابتلاء (ترجمہ البوابۃ السوداء)	از خلیل حامدی، مکتبہ ذکری، دہلی
۹۴	تحریک اخوان المسلمین ماضی وحال (ترجمہ الاخوان المسلمون والمجتمع المصری)	از ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
۹۵	تاریخ الاخوان المسلمین (اسی نام سے مصطفیٰ طحان کی کتاب کا ترجمہ)	از ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی، معہد الامام حسن البنا شہید بھٹکل
۹۶	امام حسن البنا یکتائے روزگار شخصیت (ترجمہ مجموعۃ خطابات عبداللہ العقیل)	از ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی
۹۷	مجدد ملت امام حسن البنا، اپنی ذات میں ایک امت (ترجمہ الامام حسن البنا مجدد القرن رجل بأحد وأمۃ فی رجل)	از ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی، مکتبۃ المنار، دہلی
۹۸	حسن البنا شہید ایک مطالعہ	از عبدالغفار عزیز، سلیم منصور خالد، منشورات، نئی دہلی
۹۹	نیل کا مسافر	اختر حسین عزمی، منشورات لاہور، نئی دہلی، معہد امام حسن البنا شہید بھٹکل
۱۰۰	اخوان المسلمون کا تربیتی نظام (ترجمہ الاخوان المسلمون للقرضاوی)	عبیداللہ فہد فلاحی
۱۰۱	تعلیمات حسن البنا	محمد حنیف، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی
۱۰۲	اخوان المسلمون (ترجمہ الاخوان المسلمون، سعید حوی)	عبیداللہ فہد فلاحی، ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی